تدبّر

زیرِ نگرانی

مولانا امین احسن اصلاحی

یکے از مطبوعات

ادارہ تدبّرِ قرآن وحدیث

لاہور۔ پاکستان

سلسلہ نمبر ۲۳ ربیع الثانی ۱۴۰۸ھ دسمبر ۱۹۸۷ء

تدبّر

فہرستِ مضامین

تذکرہ و تبصرہ

فکرِ فراہیؒ ——— خالد مسعود ۳

تدبرِ قرآن

تفسیر سورۂ مائدہ (۳) ——— خالد مسعود ۷

افاداتِ فراہی

حکمت قرآن (۲)

حکمت کے حصول کے ذرائع ——— خالد مسعود ۱۲

بحث و نظر

مولانا فراہیؒ کی تفسیر سورۂ فیل پر اعتراضات کا جائزہ ——— مولانا نسیم ظہیر اصلاحی ۱۷

مولانا فراہیؒ اور مولانا اصلاحی کے فکرِ قرآنی پر ایک نظر ——— عطاء الرحمانؒ ۴۲

مجلسِ ترتیب

- خالد مسعود (مدیر)
- عبداللہ غلام احمد
- ماجد خاور
- محبوب سبحانی

ناشر : ادارہ تدبرِ قرآن وحدیث
رحمان سٹریٹ، مسلم کالونی
سمن آباد، لاہور - ۲۵

مطبع : المطبعۃ العربیّۃ - لاہور

قیمت : ۵/ = روپے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فکرِ فراہیؒ

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو اس نے انسانوں کی رہنمائی کے لیے اتارا۔ یہ آسمانی ہدایت کے سلسلہ کی آخری اور مکمل کتاب ہے اس لیے خداوند تعالیٰ نے اسے ہر تحریف یا شیطانی دسترس سے محفوظ و مصئون فرمایا ہے۔ یہ کتاب اسی شکل میں ہمارے ہاتھوں تک پہنچی ہے جس شکل میں یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کے حوالے کی تھی۔ یوں تو یہ پوری انسانیت کی ہدایت کے لیے آئی ہے لیکن امتِ مسلمہ اس کی حامل امت ہونے کی وجہ سے اس کی گوناگوں ذمہ داریاں رکھتی ہے۔ قرآن مجید نے خود نہایت واضح طور پر اس امت کو خبردار کیا ہے کہ اس کی سرفرازی اسی میں ہے کہ وہ اس کتاب کو زندگی کے ہر معاملے میں اپنا رہنما بنائے، اس کی وحدت کو قائم رکھے اور یہود و نصاریٰ کی طرح اس کو پارہ پارہ نہ کر دے۔ اس کتاب کو اللہ کا عہد سمجھتے ہوئے پوری امت یکسوئی کے ساتھ اسے نبھائے تاکہ اس کے اپنے اتحاد میں کوئی رخنہ نہ پڑنے پائے اور وہ اپنے اور اللہ کے دشمنوں کے لیے لقمۂ تر نہ بن جائے۔

امت اپنے دورِ زوال میں کتاب اللہ کی طرف اپنی ذمہ داریوں کو بالکل بھلا بیٹھی ہے۔ قرآن مجید کو ایک کتابِ ہدایت کی حیثیت سے پڑھنے کی ضرورت کا تو احساس ہی جیسے ختم ہو چکا ہے۔ اگر اسے پڑھا جاتا ہے تو محض ثواب کی خاطر، نہ کہ اس کی تعلیم سے واقف ہونے کی خاطر۔ جہاں تک دینی مدارس کا تعلق ہے ان میں طلبہ کو سالہا سال فقہ و کلام کی تعلیم دی جاتی ہے، حدیث کی تمام امہاتِ کتب کا دورہ کرایا جاتا ہے لیکن قرآن مجید کی طرف سے غفلت برتی جاتی ہے۔ اس کی تعلیم محض برائے بیت ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نصاب میں سے گزرنے والے کسی شخص پر اور چیزوں کی اہمیت واضح ہونا تو ممکن ہے لیکن قرآن مجید کی عظمت اس پر واضح نہیں ہو سکتی۔ پھر لوگوں نے اپنی اپنی جماعتی و سیاسی ضرورتوں کے تحت جس طرح قرآن مجید میں سے منتخب نصاب ترتیب دے لیے ہیں اس سے یہ تاثر ملنا ناگزیر ہے کہ قرآن کا عطر تو انھوں نے نکال ہی لیا ہے۔ باقی قرآن

میں کوئی چیز قابلِ توجہ نہیں۔ جن لوگوں کے ہاتھوں میں زمامِ اقتدار ہے وہ انفرادی زندگیوں میں نیکی کی کسی بات کو رواج دینے کے خواہشمند ہوں تو ہوں، اجتماعی زندگی میں وہ قرآنی ہدایت کے دخیل ہونے کو پسند نہیں کرتے۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ ہے کہ امت گروہوں میں بٹ گئی ہے۔ ہر گروہ کی اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ ہے، اتحاد پارہ پارہ ہوگیا ہے اور وحدت کی جگہ بغض و عناد اور تعصبات نے لے لی ہے۔ قرآن مجید نے ہمیں خبردار کیا تھا کہ یہود و نصاریٰ نے اپنی کتاب کے بعض حصوں کو نظرانداز کیا تو ان کے اندر اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے لیے عداوت و بغض ڈال دیا، تم یہ غلطی نہ کرنا۔ لیکن افسوس ہمارے ہاں بھی یہی غلطی کی گئی ہے اور اس کی اصلاح سے لوگ غافل ہیں۔

مولانا حمید الدین فراہیؒ نے زوالِ امت کے اس بڑے سبب کو سمجھا اور اصلاحِ احوال کے لیے یہ کوشش کی کہ قرآن مجید کو ہر معاملے میں اس کا صحیح مقام دیا جائے۔ ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ اول تو لوگ ان کے نام اور کام سے واقف نہیں اور اگر ان کے بارے میں کچھ سن رکھا ہے تو گروہی عصبیتوں کے باعث ان سے بدکے ہوئے ہیں۔ مولانا فراہیؒ نے جو فکر دیا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن مجید کلام اللہ ہونے کی حیثیت سے دوسری ہر چیز پر حاکم ہے، لہٰذا دوسرے تمام علوم قرآن کے تابع ہیں۔ ہر وہ علم جس کا تعلق قرآن کے موضوع سے ہے اسی سے مستنبط ہونا چاہیے۔ اس کی بنیادیں قرآن کی دی ہوئی ہدایت پر استوار ہونی چاہئیں۔ چنانچہ فقہ ہو یا کلام، فلسفہ ہو یا دوسرے عمرانی علوم، مولانا فراہی ہر علم کو اس بنیاد پر جانچتے ہیں جو قرآن مجید نے مہیا کی ہے۔ سنت رسول اللہ کے نزدیک دین کی بنیادوں میں سے ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے احکام خود قرآن ہی سے مستنبط ہیں۔ علمِ روایتِ حدیث میں محدثین کی خدمات کو مولانا فراہیؒ قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ جیسا کہ ان کے اس مضمون سے بھی ظاہر ہے جو اسی اشاعت میں دیا جا رہا ہے۔ البتہ روایت میں چونکہ انسانی کوششوں کو دخل ہے، یہ قرآن کی طرح محفوظ نہیں اور محدثین کے اصول کے مطابق اس میں صدق و کذب دونوں کا احتمال ہوتا ہے اس لیے مولانا فراہیؒ اس بات کے قائل ہیں کہ روایت کو قرآن پر پرکھنا چاہیے اور قرآن پر حاکم نہیں بلکہ اس کا محکوم سمجھنا چاہیے۔ ان کی مطبوعہ کتابوں یا غیر مطبوعہ مسودات میں قرآن کی بالاتری کا پیغام نہایت واضح ہے۔

فکرِ فراہیؒ کو مولانا امین احسن اصلاحی نے جس طرح اپنایا اور وسیع دائروں میں اس کا اطلاق کیا ہے وہ ان کی تفسیر تدبرِ قرآن اور دوسری مصنفات سے واضح ہے۔ ہر موضوع میں قرآنی تعلیمات سے انہوں نے جس طرح بنیادیں فراہم کی ہیں اس سے اس موضوع کو ایک نیا اور محکم قلب ملا ہے۔ ان کی کتاب تزکیہ نفس اور فلسفہ کے مضامین دیکھیے، ہر ایک میں قرآنی بنیادوں کو مان کر جو عمارت تعمیر ہوئی ہے وہ

کتنی عالیشان ہے۔ اگر اسی طرز پر دوسرے جدید علوم پر کام کیا جائے تو بعید نہیں کہ مسلمان دنیا کو قرآن سے ماخوذ وہ متبادل علم مہیا کر دیں جس کے میدان میں موجود نہ ہونے کے باعث یہ علوم انسان کے لیے فتنہ اور خطرہ بنے ہوئے ہیں۔ تفسیر تدبرِ قرآن نے قرآن کے استدلال کو جس طرح واضح کیا ہے وہ اسی کا حصہ ہے۔ گروہی تعصبات اس تفسیر کی راہ میں مزاحم تو ہو سکتے ہیں لیکن اس کے دل نشین مباحث کے اثر کو کالعدم نہیں کر سکتے۔

ہمارے ہاں عموماً علمی بیداری نہیں پائی جاتی اس لیے بعض لوگ مولانا فراہیؒ کے فکر کو بالکل غلط طور پر پیش کرتے ہیں اور اس کو ماضی کے معتزلہ سے خوشہ چینی یا حال کے پرویزی فکر کی طرح کا کوئی فتنہ سمجھتے ہیں۔ انہیں یہ یاد نہیں رہتا کہ معتزلہ کے افکار سے واقف ہونے کا کوئی معتبر ذریعہ ہم تک منتقل نہیں ہوا۔ ایک تفسیر کشاف موجود ہے۔ اس کا تقابل تدبرِ قرآن سے کیجیے تو کسی بھی پہلو سے دونوں میں کوئی مماثلت نہیں پائی جاتی۔ پرویزی فکر انکارِ سنت اور خود قرآن کے مسلمات سے انحراف پر مبنی ہے جبکہ تدبرِ قرآن کی ہر چیز قرآن کے الفاظ، اسلوبِ بیان، نظائر اور سیاق و سباق کے ساتھ اتنے گوناگوں واسطوں سے مربوط ہے کہ اس کو تفسیر بالرائے قرار دینے والوں کے علم کے کھوکھلا پن پر حیرت ہوتی ہے۔ اس تفسیر میں سنت کا اثبات ہے اور روایاتِ حدیث کو قرآن کے تابع رکھ کر سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ قرآن کی عظمت کا تقاضا یہی ہے کہ ایسا کیا جائے۔ یہ بات صرف ان لوگوں کو کھلتی ہے جن کا اصل مدار روایت پر ہے۔ اول تو قرآن کو وہ کوئی اہمیت دینے کو تیار نہیں۔ اگر ہوں بھی تو روایت ان کے نزدیک قرآن پر حاکم ہوتی ہے، خواہ اس سے قرآن کا منشا بدل رہا ہو یا اس کی حفاظت مخدوش قرار پاتی ہو یا رسول اللہ کی معصومیت پر حرف آتا ہو۔

فکرِ فراہیؒ دین کی تمام بنیادوں کو مانتے ہوئے قرآن و حدیث، فقہ، کلام ہر چیز کو اس کی صحیح جگہ دینے کی ایک کوشش کا نام ہے۔ اس میں ہر بات دلیل سے کرنے کا رواج ڈالا گیا ہے۔ اس کی مخالفت اسی طرح کی جا سکتی ہے جس طرح ہر علمی چیز کی کی جا سکتی ہے۔ آپ دلیل کا جواب دلیل سے دیجیے، بحث کے لیے نکات اٹھائیے تو یہ اختلاف علمی ترقی کا باعث اور ان شاء اللہ امت کے لیے باعثِ رحمت ہوگا۔ اس فکر کو غلط معنی پہنا کر اس کا پروپیگنڈا کیا جائے گا تو یہ وہ حرکت ہے جس کے لیے ہماری قوم کو متعصب اور تنگ نظر ہونے کا طعنہ دیا جاتا ہے۔

اس شمارہ میں دو مضامین شاملِ اشاعت ہیں۔ ایک مضمون میں مولانا فراہیؒ کی تفسیر سورۃ الفیل پر کیے گئے اعتراضات کا جواب نہایت علمی انداز میں دیا گیا ہے جس سے مسئلہ کے بعض نئے پہلو روشنی میں آگئے ہیں۔ دوسرا مضمون روزنامہ نوائے وقت میں چھپنے والے ایک ایسے مضمون کے جواب میں ہے جس میں فاضل مضمون نگار نے فکرِ فراہی پر کوئی علمی تنقید نہیں کی تھی بلکہ عامیانہ انداز میں اس پر تبصرہ کیا تھا۔ اس مضمون

کو پڑھنے والا ہر شخص جو فکرِ فراہی سے بھی واقف ہو، وہ یہ رائے قائم کرتا ہے کہ یا تو فاضل مضمون نگار علمی مسائل کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے یا پھر شدید تعصب میں مبتلا ہیں کہ انہیں غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے خدا کا خوف لاحق نہیں ہوا۔ ایسے مضمون کسی توجہ کے مستحق نہیں ہوتے، تاہم چونکہ اِس مضمون میں بعض باتیں اچھے اسلوب سے سامنے آگئی ہیں جو ہمارے قارئین کے لیے بھی افادیت کا باعث ہوں گی۔ اس لیے ہم اس مضمون کو اپنے صفحات میں جگہ دے رہے ہیں۔ دونوں مضامین میں قابل بحث امور خود معترضین کے الفاظ میں بیان کر دیے گئے ہیں اس لیے ان کا نقطہ نظر سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ امید ہے قارئین ان مضامین سے فکرِ فراہیؒ کے بارے میں اپنی الجھنوں کو رفع کر سکیں گے۔

بقیہ : مولانا فراہیؒ کی تفسیر سورۂ فیل پر اعتراضات کا جائزہ

"یک قلم بے بنیاد ہیں۔ از روئے سند ان میں سے ایک روایت بھی قابل اعتماد نہیں۔ یہ تمام روایات ابن اسحاق تک منتہی ہوتی ہیں اور اہل فن کے نزدیک یہ طے شدہ ہے کہ یہ یہود اور غیر ثقہ راویوں سے روایت کرتے ہیں"[۱۵] واللہ اعلم بالصواب۔

ماخوذ از اشراق لاہور

بحوالہ مجلہ 'تحقیقات اسلامی' اعظم گڑھ۔

تفسیر سورۂ مائدہ (۳)

اے پیغمبر، ان لوگوں کی روش تمہیں غم میں نہ ڈالے جو کفر کی راہ میں سبقت کر رہے ہیں، ان لوگوں میں سے جو زبان سے تو دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں حالانکہ ان کے دلوں نے ایمان قبول نہیں کیا ہے اور ان لوگوں میں سے جنھوں نے یہودیت اختیار کی ہے۔ یہ جھوٹ کے رسیا اور دوسروں کی باتیں ماننے والے ہیں، جو خود تمہارے پاس نہیں آتے۔ وہ کلام کو اس کا موقع و محل معین ہونے کے باوجود اس کے محل سے ہٹا دیتے ہیں، کہتے ہیں اگر تمہارے معاملے کا فیصلہ یہ ہو تب تو قبول کر لینا اور اگر یہ نہ ہو تو اس سے بچ کے رہنا۔ اور جس کو اللہ فتنہ میں ڈالنا چاہے تو تم اللہ کے مقابل اس کے معاملے میں کچھ نہیں کر سکتے۔ یہی لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے پاک کرنا نہیں چاہا۔ ان کے لیے دنیا میں بھی رسوائی ہے اور آخرت میں بھی ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔ یہ جھوٹ کے رسیا اور پکے حرام خور ہیں۔ اگر یہ تمہارے پاس آئیں تو تمہیں اختیار ہے، خواہ ان کے معاملے کا فیصلہ کرو، یا ان کو ٹال دو۔ اگر تم ان کو ٹال دو گے تو یہ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں گے اور اگر تم فیصلہ کرو تو ان کے درمیان قانونِ عدل کے مطابق فیصلہ کرو۔ اللہ قانونِ عدل پر عمل کرنے والوں ہی کو دوست رکھتا ہے[۳۴] اور یہ تمہیں حکم کس طرح بناتے ہیں جب کہ

---

[۳۴] ان آیات میں منافقین اور یہود کی اس ملی بھگت کی طرف اشارہ ہے جو انھوں نے شرعی احکام و قوانین، بالخصوص تعزیرات و حدود کی گرفت سے بچنے اور ایک دوسرے کو بچانے کے لیے باہم کر رکھی تھی۔ مدینہ کے آس پاس یہود کی بستیاں اپنے حدود میں قبائلی نوعیت کا اقتدار رکھتی تھیں اور ان کے حکام لوگوں کے معاملات و نزاعات کا فیصلہ کرتے تھے لیکن یہود نے خود قانون ہی کو اپنے اغراض کے تحت مسخ کر کے بالکل بے اثر کر دیا تھا۔ نیز جھوٹ اور رشوت

تورات ان کے پاس موجود[۳۸] ہے جس میں اللہ کا حکم موجود ہے، پھر حکم بنانے کے بعد برگشتہ ہو جاتے ہیں! یہ ہرگز باایمان لوگ نہیں ہیں ۝ ۴۳

بے شک ہم نے ہی تورات اتاری جس میں ہدایت اور روشنی[۳۹] ہے، اسی کے مطابق خدا کے فرمانبردار، انبیاء، ربانی علماء اور فقہاء یہود کے معاملات کے فیصلے کرتے تھے، بوجہ اس کے کہ وہ کتاب الٰہی کے امین اور اس کے گواہ ٹھہرائے گئے تھے کہ لوگوں سے نہ ڈرو مجھ سے ڈرو اور میرے احکام کو دنیا کی متاع حقیر کے عوض نہ فروخت کیجیو اور جو لوگ اللہ کی اتاری ہوئی شریعت کے مطابق فیصلے نہ کریں تو یہی لوگ کافر ہیں ۝ اور ہم نے اس میں ان پر فرض کیا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور اسی طرح دوسرے زخموں کا بھی قصاص[۴۰] ہے۔ سو جس نے اس کو معاف کر دیا تو وہ اس کے لیے کفارہ ہے اور جو اللہ کی اتاری ہوئی شریعت کے مطابق فیصلے نہ کریں گے تو وہی لوگ ہیں[۴۱] جو ظالم ٹھہریں گے ۝ ۴۵

کا ان کے ہاں اتنا زور تھا کہ کسی معاملے میں نہ گواہوں کی گواہی کا کوئی وزن باقی رہ گیا تھا نہ عدالتوں کے انصاف کا۔ منافقین اور یہود اول تو خود ہی تحریف کے چور دروازے سے مجرم کے لیے فرار کی راہ نکال دیتے اور اگر اس میں کچھ زحمت پیش آتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں معاملہ کو بھیج دیتے لیکن اس ہدایت کے ساتھ کہ فیصلہ حسب منشا ہو تو قبول کرنا ورنہ اس سے کترا جانا۔ فرمایا کہ یہ لوگ گناہوں کی کیچڑ ہی میں لت پت رہنے میں لذت و راحت محسوس کرتے ہیں تو سنت الٰہی کے تحت ان کے دلوں کی تطہیر نہیں ہو سکتی۔ تم اگر ان کے معاملے کا فیصلہ کرنا چاہو تو اسی قانون عدل و قسط کے مطابق کرو جو اللہ نے تم پر نازل فرمایا ہے۔

۳۸ یہ تعجب کا اظہار اس بات پر ہے کہ یہ لوگ آپ کو حکم بنانے کے بعد آپ کے فیصلے سے مکرتے کس طرح ہیں۔ جب کہ آپ کے فیصلے شریعت الٰہی کے مطابق ہوتے ہیں۔ ان کی یہ روش ہر پہلو سے دعوائے ایمان کے منافی ہے۔

۳۹ اب یہ اس بات کا بیان ہے کہ تورات سے متعلق یہود پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی تھیں، ان کے صالح اسلاف نے ان ذمہ داریوں کو کس طرح نبھایا اور اب انھوں نے کس طرح اس عہد الٰہی کو بچوں کا کھیل بنا رکھا ہے۔

۴۰ تورات کا یہ حکم خروج ۲۱ : ۲۳ - ۲۵، احبار ۲۴ : ۲۰ اور استثنا ۱۹ : ۲۱ میں مذکور ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دراصل یہ حدود ہی کے معاملات تھے جو یہود کے لیے سب سے زیادہ مزلہ قدم ثابت ہوئے۔

۴۱ ان آیات میں یہ مضمون تین مرتبہ بیان ہوا ہے۔ یہ اگرچہ ہے تو یہود سے متعلق لیکن بعینہٖ یہی جرم اگر مسلمانوں کے کسی گروہ سے صادر ہو کہ وہ اختیار و آزادی رکھتے ہوئے کتاب الٰہی کے مطابق معاملات کا فیصلہ نہ کریں بلکہ علی الاعلان

اور ہم نے ان کے پیچھے، انھی کے نقش قدم پر عیسیٰ ابن مریم کو بھیجا تصدیق کرتے ہوئے پیشتر سے موجود تورات کی اور ہم نے اس کو عطا کی انجیل، ہدایت اور روشنی پر مشتمل، تصدیق کرتی ہوئی اپنے سے پیشتر موجود تورات کی اور ہدایت و نصیحت خدا ترسوں کے لیے ۝ اور واجب ہے کہ اہل انجیل بھی فیصلہ کریں اس کے مطابق جو اللہ نے اس میں اتارا اور جو اللہ کے اتارے ہوئے قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں تو وہی لوگ نافرمان ہیں ۝ ۴۷

اور ہم نے تمھاری طرف کتاب اتاری حق کے ساتھ، تصدیق کرتی ہوئی اس سے پیشتر سے موجود کتاب کی اور اس کے لیے کسوٹی بنا کر، تو ان کے درمیان فیصلہ کرو اس کے مطابق جو اللہ نے اتارا اور اس حق سے ہٹ کر، جو تمھارے پاس آ چکا ہے، ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو۔ ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک ضابطہ اور ایک طریقہ[۴۳] ٹھہرایا۔ اور اگر اللہ چاہتا تو تم کو ایک ہی امت بنا دیتا لیکن اس نے چاہا کہ اس چیز میں تمھاری آزمائش کرے جو اس نے تم کو بخشی، تو بھلائیوں کے لیے ایک دوسرے پر سبقت کرنے کی کوشش کرو۔ اللہ ہی کی طرف تم سب کا پلٹنا ہے تو وہ تمھیں آگاہ کرے گا اس چیز سے جس میں تم اختلاف کرتے رہے ہو ۝ ۴۸

اور یہ کہ ان کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے اتارا ہے اور ان کی خواہشوں کی

اس سے انحراف اختیار کریں (جس کی شہادت ہر مسلمان ملک میں موجود ہے) تو ان کا حکم بھی یہی ہو گا کیونکہ خدا کا قانون سب کے لیے ایک ہی ہے۔ کتاب الٰہی کا اصل مقصد یہی ہے کہ وہ زندگی کے معاملات و نزاعات میں امر و حکم اور فیصلہ و قضا کا ذریعہ بنے اور تمام اجتماعی و سیاسی اور قانونی معاملات اسی کی روشنی میں انجام پائیں۔ اگر کتاب الٰہی کی یہ حیثیت تسلیم نہ کی جائے تو یہ اس کے ساتھ مذاق ہے۔

۴۲ آیت میں قرآن مجید کے لیے 'مہیمن' کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی محافظ و نگران کے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ قرآن اصل معتمد نسخہ کتاب الٰہی کا ہے اس لیے وہ دوسرے صحیفوں کے حق و باطل میں امتیاز کے لیے کسوٹی ہے جو بات اس کسوٹی پر کھری ثابت ہو گی وہ کھری ہے، جو اس پر کھوٹی ثابت ہو گی وہ محرف ہے۔

۴۳ آیت میں شرعۃ اور منہاج کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ان سے مراد شریعت کا وہ ظاہری ڈھانچہ اور قالب ہے جو دین کے حقائق کو بروئے کار لانے کے لیے ہر مذہب میں اختیار کیا گیا ہے۔ بعض حقائق کے لیے قالب خود اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا۔ اور بعض کے لیے نبی نے فرمایا غالباً اسی وجہ سے دو الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ سیاق و سباق دلیل ہے کہ یہ آیت اہل کتاب کے ساتھ اظہار رواداری کے لیے نہیں بلکہ ان کے رویے سے اظہار بیزاری اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے لیے تسکین و تسلی اور راہ حق میں سبقت کی دعوت کے لیے ہے۔

پیروی نہ کرو اور ان سے ہوشیار رہو کہ مبادا وہ تمہیں اس چیز کی کسی بات سے پھسلا دیں جو اللہ نے تمہاری طرف اتاری ہے۔ پس اگر وہ اعراض کریں تو سمجھ لو کہ اللہ ان کو ان کے بعض گناہوں کی سزا دینا چاہتا ہے اور بے شک ان لوگوں میں سے بیشتر نافرمان ہی ہیں ۃ کیا یہ جاہلیت کے فیصلہ کے طالب[۴۴] ہیں؟ اور اللہ سے بڑھ کر کس کا فیصلہ ہو سکتا ہے ان لوگوں کے لیے جو یقین کرنا چاہیں ۃ ۵۰

اے ایمان والو، تم یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں اور تم میں سے جو ان کو اپنا دوست بنائے گا تو وہ انہی میں[۴۵] سے ہے۔ اللہ ظالموں کو راہ یاب نہیں کرے گا ۃ تم ان لوگوں کو، جن کے دلوں میں روگ ہے، دیکھتے ہو کہ وہ ان کی طرف پینگیں بڑھا رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہمیں اندیشہ ہے کہ ہم کسی مصیبت میں نہ پھنس جائیں تو بہت ممکن ہے کہ اللہ فتح یا اپنی طرف سے کوئی خاص بات دکھائے اور انہیں اس چیز پر جو یہ اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں، نادم ہونا پڑے[۴۶] ۃ اور اس وقت اہل ایمان کہیں گے کہ کیا یہ وہی لوگ ہیں جو بڑے زور شور سے اللہ کی قسمیں کھا کھا کر یقین دلاتے تھے کہ وہ تو تمہارے ساتھ ہیں۔ ان کے سارے اعمال ڈھے گئے اور وہ نامراد ہوئے ۃ ۵۳

شریعت کے ظواہر و رسوم ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس لیے الگ الگ مقرر فرمائے ہیں کہ یہ چیزا متوں کے امتحان کا ذریعہ بنے اور وہ دیکھے کہ کون ظواہر و رسوم کے تعصب میں گرفتار ہو کر حقائق سے منہ موڑ لیتا ہے اور کون حقیقت کا طالب بنتا اور اس کو ہر اس شکل میں قبول کرنے کے لیے آگے بڑھتا ہے جس میں وہ خدا اور اس کے رسول کی طرف سے اس کے سامنے آتی ہے۔

[۴۴] ہر وہ قانون جو خدا کے اتارے ہوئے قانون کے خلاف ہے وہ جاہلیت کا قانون ہے، خواہ وہ قرونِ مظلم کی تاریکی میں وجود پذیر ہوا ہو یا بیسویں صدی کی روشنی میں۔ کسی حامل شریعت گروہ کی اس سے بڑی بدقسمتی اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ خدا کی اتاری ہوئی شریعت کو چھوڑ کر کہیں اور سے فیصلہ چاہے۔

[۴۵] یہ ممانعت اسلام اور مسلمانوں کے مقابل میں ان کو دوست بنانے کی ہے۔ اس معاملے میں انفرادی مصالح اور انفرادی مراسم کو کوئی وزن نہیں دینا چاہیے۔ جس طرح وہ مسلمانوں کے خلاف بحیثیتِ جماعت ملتِ واحدہ ہیں اسی طرح مسلمان ان کے مقابل میں ملتِ واحدہ بنیں ورنہ ان کا دعوائے اسلام بالکل بے حقیقت ہو جائے گا۔

[۴۶] یہ منافقین کی کیفیت سے پردہ اٹھایا ہے۔ وہ اپنے لیے بہتر روش یہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں اور ان کے مخالفین دونوں سے راہ و رسم باقی رکھنے کی کوشش کی جائے۔ فرمایا کہ آخری اور مکمل فتح کے بعد یا کسی ایسی صورت حال میں جس میں منافقین کا سارا بھانڈا پھوٹ جائے ان کو برسرِ عام رسوا ہونا پڑے گا۔

اے ایمان والو، جو تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا تو اللہ کو کوئی پروا نہیں، وہ جلد ایسے لوگوں کو اٹھائے گا جن سے وہ محبت کرے گا اور وہ اس سے محبت کریں گے۔ وہ مسلمانوں کے لیے نرم مزاج اور کافروں کے مقابل میں سخت ہوں گے، اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروا نہ کریں[۴۷] گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے، وہ جس کو چاہے بخشے گا اور اللہ بڑی سمائی رکھنے والا اور علم والا ہے ۃ ۵۴

تمہارے دوست اور معتمد تو بس اللہ، اس کا رسول اور وہ اہل ایمان ہیں جو نماز کا اہتمام کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں فروتنی کے ساتھ ۃ اور جو اللہ، اس کے رسول اور اہل ایمان کو دوست بناتے ہیں تو وہ اللہ کی پارٹی ہیں اور اللہ کی پارٹی ہی ہے جو غالب[۴۸] رہنے والی ہے ۃ ۵۶

---

[۴۷] یہ واضح کرنے کے بعد کہ منافقین کی یہ روش ارتداد کی روش ہے بتایا کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ زمین میں اپنے دین کا گواہ اور علم بردار بنا کر کھڑا کرتا ہے ان کی صفات کیا ہوتی ہیں لیکن منافقین ان کے برعکس صفات کے حامل ہیں۔ خدا سے محبت کی شہادت یہ ہوتی ہے کہ بندہ خدا کے احکام و ہدایات اور اس کے نبی کے طریقہ و فیصلہ کا پابند ہو جاہلیت کے فیصلہ کا طالب ہونا خدا سے بیزار ہونے کی علامت ہے۔ مسلمان کو نرم خو، متواضع اور لچک قبول کرنے والا ہونا چاہیے لیکن کافروں کے لیے وہ پتھر کی ایک چٹان ثابت ہو کہ وہ آسے اپنے اغراض و مقاصد میں استعمال نہ کر سکیں۔ منافقین اس کے برعکس یہود اور مشرکین کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے۔ اللہ کا کلمہ بلند کرنے اور اس کے دین کو قائم کرنے کی جدوجہد میں پہلی شرط یہ ہے کہ آدمی اپنے تمام مفادات اور دلچسپیوں سے منہ موڑ کر اور دوسروں کی نصیحتوں اور ملامتوں سے کان بند کر کے اس میدان میں اترے۔ منافقین کا رویہ بالکل اس کے برعکس تھا۔

[۴۸] اس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلا کہ منافقین جو یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست اور معتمد بنا رہے ہیں یہ شیطان کی پارٹی ہیں اور شیطان کی تدبیر چونکہ ضعیف اور بودی ہوتی ہے اس وجہ سے ان کی ناکامی و نامرادی ان کی تعبیر ہی کے اندر مضمر ہے۔

حکمتِ قرآن (۲)

حکمت کے حصول کے ذرائع

اہلِ حکمت کی قسمیں :

جس طرح بعض حکیم ایسے ہوتے ہیں جن کو نہ صرف فہم حاصل ہوتا ہے بلکہ ان کی رائے بھی درست ہوتی ہے ، اسی طرح بعض کلام نصیحت کے کلمات اور اعلیٰ اخلاق دونوں کو سمیٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ بعض حکیم اس خصوصیت کے حامل ہوتے ہیں کہ وہ دوسروں کو حکمت کی تعلیم اور صحیح سوچ اور سچی بات کی طرف رہنمائی دیتے ہیں ، اسی طرح بعض علوم کی نوعیت بھی یہ ہے کہ وہ فہم اور استدلال کے اصول سے آگاہ کرتے ، حقیقی معارف کی راہ دکھاتے اور وہ طریقہ بتاتے ہیں جس سے بندہ طبیعت کی آلودگیوں سے پاکی حاصل کر سکتا ہے ۔

جس طرح ہر تندرست آدمی علم طب کا جاننے والا نہیں ہوتا اسی طرح یہ ضروری نہیں کہ ہر صاحبِ حکمت آدمی حکمت کا واقعی علم بھی رکھتا ہو ۔ پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر صاحبِ علم اپنے علم سے دوسرے شخص کو واقف کر سکے کیونکہ تعلیم ایک مشکل کام ہے اور طویل مشغولیت چاہتا ہے لہٰذا حکیم کبھی تو اپنی ذاتی مصروفیت کے باعث حکمت کی تعلیم پر قادر نہیں ہو سکتا اور کبھی یہ مشکل پیش آتی ہے کہ مطالب کو طالبِ علم کے لیے وہ پوری وضاحت اور خوبیِ بیان کے ساتھ ادا نہیں کر پاتا ۔

اس فرق کے علاوہ کہ جو حکمت کی تعلیم دینے والے حکیم اور تعلیم نہ دینے والے حکیم کے درمیان ہے یہ بات بھی نہایت تعجب خیز ہے کہ بہت سارے لوگ جو حکمت کی تعلیم دیتے ہیں خود حکیم نہیں ہوتے ۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے شہد کی بوتل میں شہد کی مٹھاس نہیں ہوتی یا کتاب کا ورق اس چیز کا خود عالم نہیں ہوتا جو اس میں لکھی ہوتی ہے لہٰذا اس طرح کا استاد حکیم کے اقوال کا ناقل یا کتابوں کا بوجھ اٹھانے والا ہوتا ہے ۔ قرآن مجید میں یہود کے علماء کی یہ صفت بیان ہوئی ہے کہ انہیں تورات اٹھوائی گئی

لیکن انہوں نے اس کو اٹھا کر نہیں دیا ۔ بالکل اسی طرح حکمت کی تعلیم دینے والے یہ لوگ صرف کلماتِ حکمت کی باتیں سنانے والے ہوتے ہیں اور اس کام کو سیکھنا کچھ مشکل امر نہیں ۔

حکمت کے حصول کے ذرائع :

جہاں تک اس حکمت کا تعلق ہے جو بصیرت اور فہم پیدا کرتی ہے تو حقیقی حکمت وہی ہے ۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطائے خاص ہوتی ہے جس کے سیکھنے کا کوئی دوسرا طریقہ نہیں ۔ البتہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کی ایک ضد اور اس کے لیے رکاوٹ بنائی ہے اسی طرح اس نے ہر چیز کے لیے ایک ذریعہ اور راستہ بھی پیدا کیا ہے ۔ پس جو شخص حکمت کا طالب ہو ، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کے ذرائع کو اختیار کرے ، اس کے دروازوں میں گھس جائے ، اس کے حصول کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرے اور اللہ تعالیٰ سے اسے مانگے ، اس کے لیے وہ اس کے حضور سائل بن کر کھڑا رہے اور اس کی تسبیح کرتا ہوا اس کے آگے سجدہ ریز ہو ۔ وہ یقین رکھے کہ حکمت چونکہ خدا کی جانب سے ایک نور ہے ، اس لیے خدا کے سوا کوئی اسے عطا نہیں کر سکتا ۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن نازل فرمایا ہے جس میں وہ تمام صفات اور اعمال بتائے ہیں جن کے ذریعے سے حکمت حاصل ہوتی ہے ۔ ہم ان میں سے بنیادی چیزیں یہاں بیان کرتے ہیں :

پہلی چیز اللہ تعالیٰ کی طرف ایک ایسی توجہ ہے جو خشیت ، محبت اور عاجزی کے ساتھ ہو ۔ یہ ایک تو نصف شب کی نماز سے حاصل ہوتی ہے ، جب تمام انسان سو رہے ہوتے ہیں ، دوسرے یہ ٹھہر ٹھہر کر اور غور و فکر کے ساتھ قرآن مجید کی تلاوت سے ہوتی ہے ۔ دوسری چیز لوگوں کے ساتھ رحمت و شفقت کا سلوک اور ان کی خیر خواہی ہے ۔ یہ دو چیزیں بہت سی اچھی صفات پیدا کرنے کا موجب بنتی ہیں ، الغرض ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حکم سے حکمت بھی نازل ہوتی ہے مگر اسی قدر جتنی وہ دینا چاہے اور جیسی وہ دینا چاہے لیکن یہ ہوتی حقیقی حکمت ہے نہ کہ اس کی نقل یا اس کا یاد کیا ہوا کوئی حصہ ۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں بنیادوں کی طرف رہنمائی دی ہے ۔ سورہ بقرہ میں انفاق کی ترغیب ، اس کی کچھ تمثیلات کے بیان اور انفاق کو خدا کے فضل اور نور کا ذریعہ بتانے کے بعد فرمایا :

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَاۤءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۗ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۔ (البقرہ - ۲۶۹)	وہ حکمت عطا کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور جس کو حکمت عطا کی گئی اسے خیرِ کثیر کا خزانہ دے دیا گیا اور یاد دہانی تو بس اہلِ عقل ہی حاصل کرتے ہیں ۔

اس آیت کے بعد ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جو حکمت پانے والوں کی ضد ہیں اور بتایا ہے کہ وہ کیسے اس آدمی کی مانند ہوتے ہیں جس کو شیطان کی چھوت نے پاگل بنا دیا ہو۔ یہ ایک نہایت واضح بات ہے کیونکہ رب کی طرف توجہ ہی سے نور کے دروازے کھلتے ہیں اور بندوں کے ساتھ ہمدردی اور شفقت وہ چیز ہے جو دل کے پردے چاک کرتی ہے اور اس کو کشادگی عطا کرتی ہے۔

قرآن مجید نے یہ دونوں بنیادی چیزیں اس مقام پر بھی بیان فرمائی ہیں جہاں شراب اور جوئے کی نجاست کا ذکر کیا ہے۔ ان کے نجس ہونے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ شیطان شراب اور جوئے کے ذریعے لوگوں میں دشمنی ڈالتا ہے اور ان کو اللہ کے ذکر اور نماز سے روکتا ہے۔ معلوم ہوا کہ اللہ کا ذکر اور انسانوں کا باہمی ہمدردی کا تعلق سارے معاملہ کی شیرازہ بندی کرتا ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے، جن کو اللہ تعالیٰ نے حکمت کے لیے خاص کر دیا تھا، یہی حقیقت بیان فرمائی ہے۔ البتہ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ذکر اللہ اور رحم دونوں کی شرائط اور آداب ہیں جن کا خیال کم ہی لوگ رکھتے ہیں اور وہ لوگ تو بے حد کم ہیں جو ان دونوں صفتوں کو جمع کرتے ہوں۔ عموماً یہ ہوتا ہے کہ جو شخص ذکر اللہ کا خیال رکھتا ہے وہ انسانوں کے ساتھ محبت سے غافل ہو جاتا ہے اور جو انسانوں کا خیال رکھتا ہے وہ ذکر اللہ سے غافل ہو جاتا ہے۔

یہ بات بھی نہایت تعجب خیز ہے کہ جو شخص نماز کے آداب و شرائط کا زیادہ خیال رکھتا ہے۔ وہی اس کی حقیقت سے غافل بھی ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ظاہر اور باطن دونوں ایک دوسرے کے بالمقابل ہیں جو شخص ظاہر کی فکر میں لگ جاتا ہے وہ باطن کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ نماز کی اصل حقیقت اللہ تعالیٰ کے لیے عاجزی، اس کا خوف، اس کی محبت اور اس سے تسکین پانا ہے۔ یہ تمام جذبات دل کو نرم کیے بغیر نہیں رہتے۔ پس ایسے آدمی کے لیے لازم ہے کہ وہ خود رحم دل بھی ہو اور یہ بات بھی یاد رکھے کہ وہ ایک رحیم رب سے سوال کرتا ہے جو دشمنوں کے ساتھ دشمنی بھی رکھتا ہے لیکن شیطان آدمی پر وہاں سے حملہ آور ہوتا ہے جہاں سے وہ اپنے آپ کو محفوظ سمجھ رہا ہوتا ہے۔

دوسری طرف دیکھیے تو بندوں کے ساتھ فیاضی اور شفقت کرنے والے کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے ایسے لوگ کم ہی نماز ادا کرتے ہیں اور یہ گمان رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی نمازوں سے بے نیاز ہے، پس وہ اپنے بندوں کے ساتھ رحمت و شفقت کو پسند کرتا ہے۔ ایسے لوگ بھی رحم اور فیاضی کی حقیقت سے غافل ہیں، کیونکہ رحم کا باطن اللہ کی خشیت ہے جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ

اور وہ لوگ جو دیتے ہیں تو جو کچھ دیتے ہیں اس حال میں دیتے ہیں کہ ان کے دل ڈرتے ہیں کہ انہیں اپنے رب کی طرف لوٹنا ہے۔ (مومنون - ۶۰)

قرآن مجید کے بکثرت شواہد اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ ذکرِ الٰہی اور بندوں پر شفقت دونوں ایک ہی اصل سے پھوٹتے ہیں۔ پس جو بندہ عاجزی اور خلوص کے ساتھ خدا کی طرف اور شفقت و ہمدردی کے ساتھ اس کے بندوں کی طرف توجہ کرتا ہے وہ وفاداری اور خدا ترسی کے دروازے میں داخل ہو گیا اور اس نے اپنے رب کو راضی کر لیا۔ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی رحمت سے یہی امید ہے کہ وہ اس کے دل کو روشن کر دے گا، اسے اپنی خوشنودی کے راستوں کی ہدایت دے گا اور اس کی نظروں میں وہ چیزیں محبوب بنا دے گا جو اس کو پسند ہیں اور یہی حکمت کی حقیقت ہے۔ باقی معاملات کی اصلیت کا علم تو خداوند تعالیٰ ہی کے پاس ہے۔

حکمت پانے کے لیے اہلیت ضروری ہے:

اوپر آیت یؤتی الحکمۃ .... الخ میں یہ جو فرمایا کہ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ (نہیں نصیحت پاتے مگر اہل عقل) تو اس سے مراد یہ ہے کہ جو اہل عقل نہیں ہیں وہ اس کو نہیں سمجھ سکتے کہ حکمت کیا ہے۔ اگر وہ حکمت کو جانتے ہوتے تو انہیں یہ بھی معلوم ہوتا کہ حکمت کے اہل کون ہیں اور یہ کہ حکمت اہل عقل کے لیے خاص ہے۔ اسی طرح وہ اس حقیقت کو بھی نہیں سمجھتے کہ حکمت خیر کثیر کا ایک خزانہ ہے۔

ہم اوپر واضح کر چکے ہیں کہ حکمت کی اصل ایمان ہے اور ہر بندۂ مومن دوسرے لوگوں کی نسبت سے زیادہ حکمت کا حامل ہوتا ہے۔ البتہ نام کا اطلاق عادت کے لحاظ سے کیا جاتا ہے۔ پس حکیم وہ شخص کہلائے گا جس کو حکمت کا وافر حصہ ملا ہو۔ یہ بالکل اس طرح ہے جس طرح کسی شخص کو اس وقت تک عالم نہیں کہا جاتا جب تک وہ علم کا وافر حصہ نہ رکھتا ہو۔

قرآن مجید نے یہ صراحت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کتاب اور حکمت کی تعلیم دی تھی۔ لہٰذا اس بات شک کی کوئی گنجائش نہیں کہ علمائے صحابہؓ نے جس طرح قرآن مجید حاصل کیا۔ اسی طرح انہوں نے حضورؐ سے حکمت بھی سیکھی۔ لیکن ایسے صحابہؓ کی تعداد زیادہ نہ تھی۔ بعد میں تعداد اور کم ہوتی گئی۔ جوں جوں امت زمانہ نبوت سے دور ہوتی گئی، اسی اعتبار سے حجابات حکمت کے نور کو ڈھانپ دیتے رہے۔ آیئے دیکھیں کہ حکمت کیسے اٹھالی گئی

صحابہؓ کرام کے دور کے بعد علم میں مشغولیت کے لحاظ سے امت تین گروہوں میں تقسیم ہو گئی۔

پہلا گروہ ان لوگوں کا تھا جو قرآن مجید پر غور و فکر، اس کی تلاوت اور تعلیم میں مشغول ہوئے۔ ان کو اس سے ہٹلنے والی کوئی دوسری چیز نہ تھی۔ علماء میں یہ لوگ حکمت کا زیادہ حصہ پا سکے اور اس کی حقیقت کو بھی سب سے زیادہ سمجھنے والے ہوئے۔ ان کے درمیان صلاحیتوں کے فرق کے لحاظ سے فرق موجود رہا۔ دوسرا گروہ ان لوگوں کا تھا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور حدیث کی روایت میں مشغول ہوئے ان کی مصروفیت آنحضرت ؐ کی احادیث اور صحابہ کرام ؓ کے آثار کو جمع کرنے اور ان پر تنقید کرنے تک محدود رہی۔ انہوں نے اس میدان میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی یہاں تک کہ انہوں نے ہر وہ دروازہ بند کر دیا جس کے راستے سے بدعت یا تحریف اسلام میں گھس سکتی تھی جس کا تجربہ سابقہ ملتوں کو ماضی میں ہو چکا تھا۔ دین میں ان لوگوں کے عظیم مرتبہ اور ان کے تقویٰ (جو حکمت ہی کا ایک دروازہ ہے) کے باوجود ان کی توجہ حکمت کے دوسرے دروازوں کی طرف کم رہی، لہٰذا ان پر حکمت کا مفہوم گڈمڈ ہو گیا۔ انہوں نے یہ گمان کر لیا کہ آیت يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (رسول ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے) میں حکمت سے مراد علم حدیث ہے لہٰذا انہوں نے اس پر اپنی پوری توجہ صرف کر دی۔ یہ بات شاید امت کے حق میں بہتر ہی ثابت ہوئی کیونکہ ان علماء نے علم حدیث کی طلب میں جب تمام قوت لگا دی تو وہ اس میدان میں اس بلند مقام تک پہنچے جس کے عُشرِ عشیر تک بھی ان سے پہلے یا بعد کی کوئی امت نہیں پہنچ سکی۔ اگرچہ یہ لوگ اس اصل حکمت کے حصول کے درپے نہ ہوئے جس کی رہنمائی قرآن میں ہے، لیکن انہوں نے فلسفہ سے اجتناب کیا جو حکمتِ الٰہیہ کی ٹھیک ضد ہے۔ لہٰذا ان علماء کو بھی حکمت کا ایک حصہ مل گیا اگرچہ انہیں یہ شعور نہیں ہوا کہ یہ حکمت آئی کہاں سے۔ ان علماء کے طرزِ عمل میں ایک دوسری مصلحت بھی تھی۔ چونکہ انہوں نے رائے اور قیاس کا انکار کیا۔ اس لیے حدیث کے جمع اور تنقید کے کام میں یہ تہمت سے بچے رہے۔ تیسری قسم کے لوگ وہ ہیں، جنہوں نے یونان کے فلسفہ و کلام میں دلچسپی لی اور گمان کر لیا کہ یہ وہ حکمت ہے جس کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے۔ یہ لوگ حکمتِ الٰہیہ سے بالکل فیض یاب نہیں ہو سکے۔

بحث و نظر

مولانا نسیم ظہیر اصلاحی

مولانا فراہیؒ کی تفسیر سورۂ فیل پر اعتراضات کا جائزہ

"مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی علمی قابلیت اور معرفت کتاب الٰہی کے متعلق دنیائے اسلام کا متفقہ فیصلہ ہے کہ وہ اپنی فکری صلاحیت، اجتہادی بصیرت اور قرآن کی معرفت میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے مولانا کی بے پناہ قابلیت کا اندازہ ان کی قرآنی تصانیف، اور اجزائے تفاسیر سے لگایا جا سکتا ہے کہ مرحوم کی نسبت جو کچھ کہا گیا ہے وہ شائبۂ مبالغہ سے قطعاً پاک ہے"۔[1]

مولانا حمید الدین فراہیؒ کے اجزائے تفاسیر میں 'تفسیر سورۂ فیل' بھی ہے، اس میں انہوں نے بڑے مدلل طور پر اس عام خیال کی تردید فرمائی ہے کہ ابرہہ کے لشکر کی بربادی سمندر کی جانب سے آئی ہوئی چڑیوں کی سنگ باری سے ہوئی تھی، اور قریش اور دوسرے اہل مکہ، ابرہہ اور اس کے لشکر جرار کے خوف کی وجہ سے دامن کوہ میں بھاگ کر چھپ گئے تھے۔ حضرت مولانا کی تحقیق کے مطابق قریش اہل مکہ اور اس وقت باہر سے زیارت کعبہ کے لیے آئے ہوئے حاجیوں نے ابرہہ کے لشکر کا نہایت جم کر مقابلہ کیا تھا اور ان کی شدید سنگ باری اور خدا کی نصرت اور تائید سے ابرہہ کا پورا لشکر تتر بتر ہو گیا، اس میں شدید بھگدڑ مچ گئی اور یہ یہاں گرا وہ وہاں گرا، یہ یہاں مرا وہ وہاں مرا کا عالم تھا۔

مولانا فراہیؒ کی اس تحقیق سے جو بڑے غور و فکر کا نتیجہ اور قطعی دلائل و شواہد پر مبنی ہے بعض اہل علم کو اتفاق نہیں ہے، انہیں لوگوں میں مولانا شبیر احمد صاحب ازہر میرٹھی بھی ہیں۔ موصوف نے ماہنامہ

---

[1] جمعیۃ العلماء ہند کا ترجمان روزنامہ "الجمعیۃ" دہلی ۱۴ر جون ۱۹۳۶ء

"جامعۃ الرشاد" اعظم گڑھ کے اکتوبر، نومبر ۱۹۸۵ء کے شمارہ میں مولانا فراہی کے مذکورہ بالا خیالات پر بعض اعتراضات کیے ہیں، سطور ذیل میں انہیں اعتراضات کا جائزہ لیا جائے گا۔

پہلا اعتراض :

مولانا شبیر احمد صاحب تحریر فرماتے ہیں :

"طیر سے مردار خور پرندے مراد سمجھنا محض بے دلیل بات ہے۔ بعض شعرائے عرب نے فخریہ اشعار میں یہ مضمون باندھا ہے کہ جنگ میں ہماری فتح مندی و ظفریابی یقینی ہے۔ ہم جب اپنے بہادر شہسواروں کو لے کر دشمن کی طرف روانہ ہوتے ہیں تو ہمارے ساتھ گدھوں کی ٹولی بھی فضا میں سرگرم پرواز ہوجایا کرتی ہے، کیونکہ انہیں یقین ہوتا ہے کہ ہم دشمنوں کو قتل کر ڈالیں گے تو انہیں کھانے کے لیے لاشیں نصیب ہوں گی، مولانا فراہیؒ نے اس شاعرانہ مبالغہ آرائی کو حقیقت واقعہ سمجھ لیا کہ فی الواقع کسی کو کوچ کرتا ہوا دیکھ کر گدھ اس کے ساتھ ہوجاتے ہیں، حالانکہ عرب و عجم میں، ملک ملک میں، لاکھوں جنگیں ہوئی ہیں، فوج کشیاں کی گئی ہیں لیکن آج تک کسی چھوٹی بڑی فوج کو کوچ کرتی ہوئی دیکھ کر گدھ اس کے ساتھ نہیں ہوئے۔"

یہ اعتراض بہت مبہم ہے کہ 'طیر' سے مردار خور پرندے مراد سمجھنا محض بے دلیل بات ہے۔ اس کا اگر مطلب یہ ہے کہ لفظ 'طیر' مردار خور پرندوں کے معنی میں آتا ہی نہیں ہے تو یہ بجائے خود بے دلیل ہے۔ آخر اس سے مردار خور پرندے کیوں مراد نہیں ہوسکتے؟ لفظ 'طیر'، 'طار یطیر' کا مصدر ہے جس کے معنی ہوا میں دونوں بازو سے اڑنے کے ہیں، پھر اسی سے منقول ہو کر پرندوں کے معنی میں استعمال ہونے لگا عام اس سے کہ پرندہ چھوٹا ہو یا بڑا۔ علاوہ ازیں قرآن مجید اور کلام عرب دونوں میں یہ لفظ مردار خور پرندوں کے معنی میں صراحۃً استعمال ہوا ہے۔ قرآن مجید میں ہے :

وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ — اور دوسرے کو سولی دی جائے گی اور اس کے سر کو پرندے کھائیں گے۔

(یوسف - ۴۱)

دوسری جگہ ارشاد ہے :

وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ — اور جو شخص اللہ کے ساتھ شرک کرتا ہے تو گویا وہ آسمان سے گر پڑا پھر پرندوں نے اس کی بوٹیاں نوچ لیں۔

(حج - ۳۱)

ان دونوں آیتوں میں لفظ 'طیر' مردار خور پرندوں کے معنی میں صراحۃً استعمال ہوا ہے۔ کلامِ عرب میں بھی اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں، پھر آیت میں 'طیر' کی صفت 'ابابیل' آئی ہے۔ جو گھوڑوں کی جماعت یا بڑی چڑیوں کے لیے بولا جاتا ہے، چنانچہ زہیر ابن ابی سلمٰی کا شعر ہے :

وبالفوارس من ورقاء قد علموا — فرسان صدق علی جرد ابابیل

اور ورقا کے ان شہسواروں کے ساتھ جو اصیل غول در غول گھوڑوں پر سوار تھے اور جن کی شجاعت مسلم تھی۔

اعشٰی کا شعر ہے :

طریق و جبار رواء اصوله — علیه ابابیل من الطیر تنعب

ان تمام شواہد کی موجودگی میں کیسے کہا جاسکتا ہے کہ لفظ 'طیر' گدھ یا دوسرے مردار خور پرندوں کے معنی میں نہیں آیا ہے یا اس معنی میں آتا ہی نہیں ہے۔ اگر مولانا محترم کا مطلب یہ ہے کہ یہاں سیاق و سباق کے اعتبار سے 'طیر' کو مردار خور پرندوں کے معنی میں لینا بے دلیل ہے تو اس کے جواب میں صرف یہی عرض کیا جاسکتا ہے کہ مولانا فراہیؒ نے اس کے متعلق عقلی و نقلی دلائل و شواہد کا انبار لگا دیا ہے۔ مولانا میرٹھی صاحب نے انہیں یکسر نظرانداز کردیا ہے، حالانکہ جب تک ان دلائل کی تردید نہ ہو مولانا کا اعتراض بے معنی ہوگا۔ یہاں مولانا فراہی کے دلائل کا ذکر موجب طوالت ہوگا۔ البتہ سورہ فیل میں مذکور چڑیوں سے متعلق بعض روایتوں کے الفاظ نقل کیے جاتے ہیں جن سے مولانا فراہی کے خیال کی تصدیق ہوتی ہے اور جن پر انھوں نے اعتماد کیا ہے اور جنہیں مولانا میرٹھی صاحب بغیر دلیل رد کر رہے ہیں۔ ان چڑیوں کے بارے میں حضرت عکرمہؓ سے روایت ہے :

کانت طیرا خضرا خرجت من البحر لها رؤس کرؤس السباع[1] — یہ چڑیاں سیاہی مائل خاکی رنگ کی تھیں جو سمندر سے آئی تھیں اور ان کے سر درندوں کے سر کی طرح تھے۔

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے :

لها خراطیم کخراطیم الطیر واکف کاکف الکلاب[2] — ان کے چڑیوں کی طرح کے سونڈ اور کتے کے پنجوں کے مانند چنگل تھے۔

حضرت سعید بن جبیر سے مروی ہے۔

طیر خضر، لها مناقیر صفر تختلف علیهم[3]۔ — یہ چڑیاں سیاہی مائل خاکی رنگ کی تھیں اور زرد[1] چونچوں سے ان کا گوشت کھاتی تھیں۔

مولانا میرٹھی صاحب فرماتے ہیں کہ "کسی جنگی ٹولے کو کوچ کرتا ہوا دیکھ کر مردار خور چڑیوں کا ان کی کامیابی کا یقین کر کے ان کے ساتھ ہو لینا محض شاعرانہ مبالغہ آرائی ہے۔" ممکن ہے کہ "چڑیوں کا یہ یقین کرنا کہ لشکر ضرور کامیاب اور فتح مند ہوگا" شاعرانہ مبالغہ آرائی ہو، لیکن کسی فوج کو کوچ کرتے ہوئے دیکھ کر گدھ وغیرہ مردار خور پرندوں کا اس کے ساتھ ہو جانا کوئی مستبعد نہیں ہے، آج بھی ہم دیکھتے ہیں جب کسی کھیت میں ہل بیل یا ٹریکٹر سے جوتائی شروع ہوتی ہے تو چھوٹے چھوٹے پرندے ان کے پیچھے ہو لیتے ہیں، اس لیے کہ انہیں یقین ہوتا ہے کہ زمین جوتے جانے پر اس کے اندر سے کیڑے مکوڑے نکلیں گے جو ان کی غذا بنیں گے، اسی طرح ہمارے یہاں دیہاتوں میں کسی گڈھے یا تالاب میں مچھلی کا شکار کرنے کے لیے جب لوگ جمع ہوتے ہیں تو ان کی بھیڑ بھاڑ اور شور و شغب کے ساتھ ہی اس تالاب کے ارد گرد چیل، کوے اور گدھ وغیرہ مختلف چڑیاں منڈلانے لگتی ہیں، جب آج مچھلی کا شکار شروع ہونے سے پہلے محض اس کی تمہید کا منظر دیکھ کر چڑیوں کا یہ حال ہوتا ہے تو پھر چودہ پندرہ سو سال پہلے جب کہ دنیا اتنی زیادہ مہذب اور ترقی یافتہ نہیں تھی اور جنگ کے میدانوں میں لاشیں سڑتی گلتی رہتی تھیں[4]۔ کسی جنگی لشکر کو کوچ کرتے ہوئے یا لڑائی ہوتے ہوئے دیکھ کر مردار خور پرندوں کا

1، 2 یہ دونوں روایتیں تفسیر ابن جریر ج ۳۰ ص ۲۹۸ میں ہیں۔ یہ دوسری روایت متعدد طرق سے مروی ہے اس میں خرطوم کا لفظ استعمال ہوا ہے جو شکاری چڑیوں کے لیے مستعمل ہے چنانچہ امرؤ القیس کا شعر ہے:

کانها القوة طلوب — کان خرطومها منقال (وہ اونٹنی جھپٹنے والے عقاب کی طرح ہے جس کی چونچ کرچھے کی مانند ہے) (تفسیر سورہ فیل از مولانا فراہی ص ۲۶ طبع ۱۹۳۷ء)

3 ابن جریر ج ۳۰ ص ۲۹۸

4 جیسا کہ ایک حماسی شاعر کہتا ہے: کم ترکنا هناك من بطل — تسفی علیها الریاح فی لمه
ہم نے وہاں میدان میں بہت سے بہادروں کو اس حال میں چھوڑ دیا کہ ہوائیں ان کے بالوں کے جوڑوں پر خاک اڑاتی تھیں۔ اس شعر کے بارے میں مولانا میرٹھی صاحب یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ صرف شاعرانہ مبالغہ آرائی ہے کیونکہ شاعر حمیری ہے اور جس جنگ کا واقعہ ہے اس میں قبیلہ حمیر کو بنو عبد مناف نے شکست فاش دی تھی اور بہت سوں

وہاں منڈلانا یا لشکر کے ساتھ ہو جانا کون سی مستبعد بات ہے؟

دوسرا اعتراض:

مولانا میرٹھی صاحب اپنے دوسرے اعتراض کے تحت لکھتے ہیں:

"پہاڑ کے اوپر سے کسی گروہ پر سنگباری اس صورت میں ہو سکتی ہے جب کہ وہ گروہ پہاڑ کے دامن میں ہو، اس صورت میں پہاڑ کے اوپر سے جو پتھر پھینکے یا لڑھکائے جائیں گے ان سے اس گروہ کو نقصان پہنچے گا، لیکن ابرہہ کی فوج کو وادی محسر میں تباہی کا سامنا کرنا پڑا ہے، جن لوگوں نے وادی محسر دیکھی ہے وہ جانتے ہیں کہ اس کے دائیں طرف یا بائیں طرف کے پہاڑ اتنے نزدیک نہیں کہ ان کے اوپر سے پھینکے ہوئے پتھر ان لوگوں کو ہلاک یا زخمی کر ڈالیں جو وادی محسر میں ہوں، مولانا فراہی نے اپنی آنکھوں سے وادی محسر دیکھی ہوتی تو ہرگز یہ تاویل نہ کرتے۔"

یہ تسلیم ہے کہ ابرہہ کی فوج کو وادی محسر میں تباہی کا سامنا کرنا پڑا جو ایک لمبی چوڑی وادی ہے اور بائیں جانب پہاڑ دوری پر واقع ہیں، اس لیے اس وادی میں ٹھہرے ہوئے لشکر پر پہاڑ کے اوپر سے پتھر مارنا یا لڑھکانا بہت مشکل تھا، مگر یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا عربوں کے سامان جنگ میں ایسے ہتھیار نہیں تھے جن سے دور دراز تک پتھر مارے جا سکتے ہوں؟ ہمارے خیال میں مولانا میرٹھی صاحب نے اس پہلو پر غور نہیں فرمایا ورنہ وہ ایسی بے وزن بات ہرگز نہ تحریر فرماتے۔ منجنیق، قذاف، قذافہ، خلاخن اور گوپھن وغیرہ عربوں کے خاص ہتھیار تھے جن کے ذریعہ وہ دور ہی سے ایسی شدید سنگ باری کرتے تھے کہ مقابل لشکر کو منٹوں میں تتر بتر ہو جانے پر مجبور کر دیتے تھے۔ جن کتابوں[1] میں جاہلی عربوں کی لڑائیوں (ایام العرب) کا مفصل تذکرہ ہے، ان میں ان ہتھیاروں کے استعمال کا بھی جگہ جگہ ذکر کیا ہے،

کو قتل کیا تھا اسی جنگ کی تصویر کشی شاعر نے اپنے اشعار میں کی ہے۔ چنانچہ مولانا مفتی اعزاز علی صاحب شرح حماسہ میں لکھتے ہیں:

وفیه یقول شاعر من حمیر — اسی جنگ کے بارے میں حمیر کا شاعر کہتا ہے اور جو
وانصف فیما قال ولذا علقت هذه — کچھ اس نے کہا ہے بالکل صحیح کہا ہے اسی لیے اس
الابیات من المنصفات — کے ان اشعار کو "منصفات" میں سے قرار دیا گیا ہے۔

1 مثلاً ابو عبیدہ کی "شرح النقائض" اور میدانی کی "مجمع الامثال" وغیرہ۔

لسان العرب میں بھی ہے کہ

قیل الاعرابی کیف کانت حروبکم؟ فقال کانت بیننا حرب عون، تفقأ فیھا العیون فتارۃ نجنق واخری نرشق[1]	کسی اعرابی سے پوچھا گیا کہ تمہاری جنگیں کیسی ہوتی تھیں تو اس نے کہا کہ ہمارے درمیان بڑی سخت جنگ ہوتی تھی، اس میں آنکھیں پھوٹ جاتی تھیں۔ کبھی ہم منجنیق سے پتھر مارتے تھے تو کبھی تیر چلاتے تھے

جنگ احزاب کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی منجنیق نصب کرنے کا حکم فرمایا تھا اور اس حکم کی تعمیل ہی نہیں کی گئی بلکہ اس سے کام بھی لیا گیا تھا۔[2]

ابرہہ کا لشکر بہت بڑی تعداد میں تھا اور ہر طرح مسلح تھا، اس لیے ضروری تھا کہ اس سے گوریلا جنگ کی جائے (جس کے عموماً عرب عادی تھے) پھر منجنیق اور قذاف وغیرہ سے سنگ باری کرنے کے لیے یہ ضروری بھی ہوتا ہے کہ مد مقابل لشکر کچھ دوری پر ہو، اس لیے وادی محسر کے بیچ میں ابرہہ کے لشکر کا پڑنا جنگی اعتبار سے عربوں کے حق میں تھا نہ کہ ان کے خلاف، چنانچہ انہوں نے دونوں طرف سے ان کو گھیر کر اپنی منجنیقوں کے ذریعہ اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔[3]

تیسرا اعتراض:

مولانا میرٹھی صاحب مزید تحریر فرماتے ہیں:

"تاریخ عالم میں ایسے بہت سے واقعات ملتے ہیں کہ دامن کوہ سے گزرتے ہوئے کسی لشکر کو فریق مقابل کے آدمیوں نے پہاڑ کے اوپر سے وزنی پتھر لڑھکا لڑھکا کر سخت نقصان پہنچایا ہے اور وزنی پتھر لڑھکائے ہی جاتے ہیں، ہاتھوں میں لے کر دور نہیں پھینکے جا سکتے۔ پس اگر لشکر ابرہہ کی تباہی بھی اسی طرح ہوئی ہوتی تو آیت میں لڑھکانے

---

[1] لسان العرب ج ۱۰ ص ۳۷ مادہ ج ن ق [2]

[3] عرب کی تاریخ و جغرافیہ پر مولانا فراہی کی بڑی گہری نظر تھی خصوصاً ان جگہوں کا انہیں بخوبی علم تھا جن کا کسی حیثیت سے قرآن پاک سے تعلق تھا۔ مولانا کو بیت اللہ کی زیارت کا بھی شرف حاصل تھا اس لیے انہوں نے بچشم خود ان تمام مقامات کا مشاہدہ فرمایا ہوگا۔ اس اعتراض میں ان پر وادی محسر نہ دیکھنے کا طنز سراسر ناروا اور غیر ذمہ دارانہ ہے۔

کا ذکر ہوتا، حالانکہ آیت میں "رمی" یعنی پھینکنے کا ذکر ہے۔"

اس کا جواب اس سے پہلے والے اعتراض میں گزر چکا ہے کہ عربوں کے سامانِ جنگ میں منجنیق، قذاف اور گوپھن وغیرہ بھی تھے جن سے وہ شدید سنگ باری کرتے تھے، ان ہتھیاروں کے ذریعہ بڑے بڑے پتھر اوپر سے لڑھکائے نہیں جاتے تھے بلکہ اوٹ سے چھپ کر یا سامنے ہی سے دشمنوں پر پتھر پھینکے جاتے تھے۔ منجنیق اور قذاف وغیرہ کے جنگی استعمال کا غالباً مولانا کو علم نہیں ہے۔ یہاں ائمہ لغت کے بعض اقوال پیش کیے جاتے ہیں۔

منجنیق: آلۃ حربیۃ ترمیٰ بھا القذائف[1]	منجنیق ایک ایسی جنگی مشین ہے جس کے ذریعہ پتھر پھینکے جاتے ہیں۔
القذاف: الذی یرمی بھا الشیٔ فیبعد[2]	قذاف ایک مشین ہے جس کے ذریعہ کوئی چیز دور پھینکی جاتی ہے۔

صاحب لسان العرب نے یہ اشعار نقل کیے ہیں:

لما اتانی الثقفی الفتان   فنصبوا قذافۃ بل ثنتان[3]

جب ثقفی نوجوان ہمارے پاس آئے تو انہوں نے ایک نہیں بلکہ دو پتھر مارنے کی مشین نصب کی۔

مزاد کا شعر ہے:

قذیفۃ شیطان رجیم رمیٰ بھا   فصارت ضواۃً فی لھازم ضرزم[4]

یہ وہ اوزار ہیں جن سے عرب پتھر مارا کرتے تھے، صرف ہاتھوں سے نہیں مارتے تھے، جیسا کہ مولانا میرٹھی صاحب کا خیال ہے، شمشیر زنی اور سنگ باری ان کا روزانہ کا معمول تھا۔ وہ ان سب کے بڑے ماہر تھے، پھر یہ کیسے باور کر لیا جائے کہ انہوں نے نہتے ہو کر اس لشکرِ جرار کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہوگا؟ بلاشبہ انہوں نے جب کہ وہ حالت احرام میں بغیر تیر اور تلوار کے تھے ان ہتھیاروں کو ضرور استعمال کیا ہوگا جو اس وقت ممکن الحصول تھے اور انہیں ہتھیاروں کے لیے جیسا کہ پہلے مثالوں سے ثابت ہو چکا ہے "رمی" کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے آیت میں لفظ "ترمی" واقعہ اور اقتضائے

---

[1] الافصاح ص ۱۹۹ طبع قاہرہ ۱۹۲۹ء

[2] ایضاً و لسان العرب ج ۹ ص ۲۷۷ مادہ ق ذ ف

[3، 4] لسان العرب ج ۹ ص ۲۷۷

حال کے عین مطابق ہے۔ اس پر سرے سے کوئی اعتراض ہی وارد نہیں ہوتا۔ لڑھکانے کی بات تو محض مولانا شبیر احمد صاحب میرٹھی کی اپج اور اختراع ہے۔ مولانا فراہی نے لڑھکانے کی کوئی بات ہی نہیں لکھی ہے کہ اس پر کوئی اعتراض وارد ہو۔

چوتھا اعتراض:

مولانا میرٹھی صاحب کا چوتھا اعتراض یہ ہے:

"اللہ تعالیٰ نے تصریح فرمائی ہے کہ وہ پھینکے ہوئے پتھر "سجیل" کی جنس کے پتھر تھے۔ مولانا فراہی کو بتانا چاہیے تھا کہ اگر ابرہہ کی فوج پر اہل مکہ نے سنگ باری کی تھی تو سجیل کے سنگریزے کہاں سے لائے تھے، جب کہ مکہ ونواحِ مکہ بلکہ تمام حجاز کی سرزمین میں سجیل کے پتھر پائے ہی نہیں جاتے۔"

مولانا میرٹھی صاحب کا یہ اعتراض بھی بالکل بے سروپا ہے کہ مکہ ونواحِ مکہ بلکہ تمام سرزمین حجاز میں سجیل کے پتھر پائے ہی نہیں جاتے" کیونکہ انہوں نے اس بے بنیاد دعویٰ کی کوئی دلیل نہیں دی ہے۔ ایسے بے ثبوت دعویٰ کی موجودگی میں کون مان سکتا ہے کہ پوری سرزمین حجاز میں کنکر (سجیل) پائے ہی نہیں جاتے۔ کنکر ایک معمولی چیز ہے اس کا ہر جگہ ہونا ممکن ہے۔ جن لوگوں نے اس وادی کو دیکھا ہے اور جو لوگ مکہ اور حجاز میں رہ چکے ہیں، ان سے دریافت کرنے پر یہی معلوم ہوا کہ وہاں کنکر پائے جاتے ہیں، خصوصاً وادی محسر کا علاقہ تو کنکروں سے بھرا پڑا ہے۔

قرآن مجید میں دو جگہ اور لفظ سجیل آیا ہے۔

۱۔ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ مَّنْضُوْدٍ	اور اس سرزمین پر ہم نے کنکر کے پتھر برسانا شروع کیے جو لگاتار گرتے رہے۔
(ھود - ۸۲)	
۲۔ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ	اور ہم نے ان پر سجیل کے پتھر برسائے۔
(حجر - ۷۴)	

ایک دوسری جگہ سجیل کی تعبیر اس طرح کی گئی ہے۔

لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ	تاکہ ہم ان پر کنکر برسائیں۔

(ذاریات - ۳۳)

ان آیتوں میں عرب بائدہ کا ذکر ہے جن کو ایسی شدید اور تباہ کن آندھی کے ذریعہ ہلاک کیا گیا تھا جو اپنے ساتھ 'سجیل' قسم کے پتھر لیے ہوئے آئی تھی اور مسلسل کئی روز تک چلتی رہی۔ یہ قومیں عرب ہی تھیں اور سرزمین حجاز میں آباد تھیں، انہیں ہلاک کرنے والی آندھی کہیں دور دراز سے کنکر پتھر لے کر نہیں آئی تھی بلکہ وہ جن راستوں سے گزری تھی انہیں میں پڑے ہوئے کنکر پتھر اپنے ساتھ اڑاتے ہوئے چلی تھی۔ اب اگر اس علاقہ میں سجیل کے قسم کے پتھر پائے ہی نہیں جاتے جیسا کہ مولانا میرٹھی صاحب کا دعویٰ ہے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ آندھیاں بھی اپنے ساتھ 'سجیل' کے پتھر کہاں سے لائی تھیں؟ مولانا ان آیات پر بھی ذرا ٹھہر کر غور فرما لیتے تو یہ عجیب وغریب اعتراض ہرگز نہ فرماتے۔ اگر بالفرض مولانا کی یہ بات تسلیم ہی کر لی جائے کہ سجیل کے پتھر حجاز میں پائے ہی نہیں جاتے تو یہ بات کس طرح مانی جا سکتی ہے کہ 'بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ' سے مراد وہی پتھر ہے جس کو جلا کر پیس کر عمارتی چونہ بنایا جاتا ہے[1]؟" حالانکہ ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

قال ابن عباس، سجیل معناہ سنگ وگل، یعنی بعضہ حجر وبعضہ طین[2]	حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ سجیل کا معنیٰ سنگ اور گل ہے یعنی اس کا کچھ حصہ پتھر اور کچھ مٹی ہے۔

پانچواں اعتراض:

اب مولانا کا اس سے بھی زیادہ دلچسپ اعتراض ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں:

"سجیل" قسم کے سنگریزے مار کر تین چار ہزار آدمی ساٹھ ہزار آہن پوش فوج کو کوئی خاص گزند نہیں پہنچا سکتے۔ سب کو ہلاک کر ڈالنے اور کھائے ہوئے بھس کی طرح بنا دینے کا ذکر ہی کیا؟"

---

[1] مولانا میرٹھی صاحب نے اپنی تفسیر میں سجیل سے مراد اسی پتھر کو لیا ہے اور خط کشید جملہ انہیں کا ہے۔

[2] تفسیر رازی ص ۱۰۱ ج ۳۲

یہ اعتراض بڑا مضحکہ خیز ہے کیونکہ 'سجیل' (سنگریزے) برسانے والے خواہ عرب ہوں یا چڑیاں، دونوں ہی صورتوں میں یہ اعتراض وارد ہوسکتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اپنے گھر کی حفاظت کرنے اور اس کی عظمت کو برقرار رکھنے کے لیے چڑیوں کے پھینکے ہوئے چنے اور دال کے برابر[1] سنگریزوں میں اتنی قوت دے سکتا ہے کہ وہ گولیوں اور بموں کا کام کریں تو کیا وہی خدا اس بات پر قادر نہیں ہے کہ جب اس کے چند ہزار کمزور بندے کفن بردوش اس کے گھر کی حفاظت کے لیے ایک جہادِ عظیم میں مصروف ہوں اور ان کا سردار (عبدالمطلب) خانہ کعبہ کے دروازے پر کھڑا ہوکر اپنے خدا کے حضور یہ پُردرد دعا کررہا ہو:

اللّٰھم ان المرء یمنع رحلہ فامنع رحالک

اے اللہ آدمی اپنے اہل کی حفاظت کرتا ہے پس تو بھی اپنے لوگوں کی حفاظت کر۔

لا یغلبن صلیبھم ومحالھم ابدا محالک

ان کی صلیب اور قوت تیری قوت پر غالب نہ ہو۔

ان کنت تارکھم وقبلتنا فامر ما بدا لک

اگر تو ہمارے قبلہ کو ان کے زیرنگیں کرنا چاہتا ہے تو وہی کر جو تیری مرضی ہو۔

یارب لا ارجو لھم سواک یارب فامنع منھم حماک[2]

اے اللہ میں ان کے بارے میں تیرے سوا کسی اور سے امید نہیں رکھتا، پس تو اپنے گھر کی ان سے حفاظت کر تو ان کے پھینکے ہوئے کنکروں اور پتھروں میں ایسی قوت نہ رکھ دے کہ ساٹھ ہزار نہیں بلکہ لاکھوں کی تعداد پر مشتمل فوج ان کی سنگ باری کی وجہ سے تباہ و برباد ہوجائے؟ مزید برآں جب کہ ان کی سنگ باری کے ساتھ تائیدِ غیبی کے طور پر آسمان سے بھی سنگ باری ہورہی ہو؟

ہم اپنی بات کی مزید وضاحت کے لیے مولانا فراہی کی تفسیر سورۂ فیل کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں:

"اس کی سب سے پہلی مثال غزوۂ بدر میں ملتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مٹھی بھر کنکریاں لیں اور قریش کی طرف رُخ کرکے فرمایا "شاھت الوجوہ" "خدایا یہ چہرے بگڑ جائیں" اس کے بعد کنکریاں ان کی طرف پھینکیں اور صحابہؓ سے فرمایا "بڑھو" نتیجہ یہ ہوا کہ تمام کفار

[1] تاریخ اور تفسیر کی تمام کتابوں میں ہے کہ چڑیوں کے پھینکے ہوئے پتھر چنے یا دال کے برابر تھے۔

[2] تفسیر رازی ج ۳۲ ص۹۶

کو آنکھوں کی پڑ گئی، اسی کی نسبت سورہ انفال میں فرمایا: وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمیٰ (۱۷) (جب تم نے کنکریاں ماریں تو تم نے نہیں ماریں بلکہ اللہ نے ماریں) دیکھو اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی رمی کو اپنی رمی کے لیے سبب ظاہر اور پردہ بنایا گو اس موقع پر دو طرف سے کنکریاں پھینکی گئیں۔ ایک پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جس کو کفار نے دیکھا اور ایک خدا کی طرف سے جس کو وہ نہ دیکھ سکے۔ لیکن اس کے اثر کو انہوں نے محسوس کیا، اسی لیے آیت میں نفی اور اثبات دونوں ساتھ ساتھ آئے ہیں، بعینہٖ یہی صورت واقعہ فیل میں بھی نظر آتی ہے، قریش سنگ باری کے زور سے ابرہہ کی فوج کو کعبہ سے دفع کررہے تھے، خداوند تعالیٰ نے اسی پردہ میں ان پر آسمان سے سنگ باری کردی، چنانچہ جس طرح غزوہ بدر کی رمی کو اپنی طرف منسوب کیا (ولکن اللہ رمیٰ) اسی طرح یہاں بھی کفار کو کھانے کے بھُس کی طرح بنادینا، اپنی قوتِ قاہرہ کی طرف منسوب کیا (فجعلھم کعصف ماکول) ظاہر ہے کہ یہ عظیم الشان معجزہ ہے، کیونکہ قریش کے لیے ابرہہ کے لشکرِ گراں کو پارہ پارہ کردینا تو درکنار اس کو شکست دے دینا بھی آسان نہ تھا[1]"

چھٹا اعتراض:

مولانا میرٹھی کا چھٹا اعتراض یہ ہے:

"عربیت کا صحیح ذوق قطعاً یہ گوارا نہیں کرتا۔ "ترمیھم" میں خطاب سنگباری کرنے والے اشخاص سے ہو، بریں تقدیر "ترمونھم" لانا ضروری تھا، اور اللہ تعالیٰ ترمیھم کے بجائے ترمونھم فرمانے سے عاجز نہ تھا۔"

مولانا فراہی کو عربی ادب کا ذوق تھا یا نہیں، اس سے یہاں بحث نہیں ہے، البتہ اس قدر عرض کرنے کو جی چاہتا ہے کہ خود مولانا میرٹھی نے صحیح ذوق کا مظاہرہ نہیں کیا ہے۔ قرآن مجید کی یہ آیت ملاحظہ ہو:

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ — کیا تم نہیں جانتے کہ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے، کیا نہیں جانتے کہ اللہ ہی کے لیے

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ لَہٗ مُلْکُ

[1] تفسیر سورۂ فیل ص۵۹ - ۶۰ (مولانا فراہی) مطبع اصلاح پریس ۱۹۳۷ء

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۝

آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے اور اللہ کے سوا تمہارا کوئی یار و مددگار نہیں۔

(البقرۃ - ۱۰۶، ۱۰۷)

ان آیات میں خطاب صیغۂ واحد "الم تعلم" سے شروع ہوا ہے اور دوبارہ پھر واحد ہی کا صیغہ "الم تعلم" استعمال ہوا ہے اور اس کے بعد "ما لکم" میں جمع کی ضمیر آگئی ہے، عربی ادب کا ذوق رکھنے والے جانتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اوپر کے دونوں واحد کے صیغوں میں مخاطب جماعت کا ایک ایک فرد علیحدہ علیحدہ مراد ہے، پھر اس کے بعد پوری جماعت کو جمع کے صیغہ سے خطاب کیا گیا، کیا یہاں بھی کہا جا سکتا ہے کہ عربیت کے صحیح ذوق کے مطابق "الم تعلم" کے بجائے "الم تعلموا" ہونا چاہیے تھا، جیسا کہ "الم تر" کے بارے میں مولانا میرٹھی صاحب نے فرمایا ہے:

دراصل یہ طریقۂ استعمال عربی زبان کا ایک خاص اسلوب ہے۔ اس کی تھوڑی سی تفصیل خود مولانا فراہی کے الفاظ میں ہم یہاں پیش کرنا چاہتے ہیں، مولانا فراہی لکھتے ہیں:

"یہ زبان کا مخصوص اسلوب ہے جس میں واحد کا اطلاق جمع پر ہوتا ہے، کلام عرب اور قرآن مجید میں اس کی مثالیں بہت ہیں، تورات میں جہاں کہیں خدا نے بنی اسرائیل کو واحد کے صیغہ سے خطاب کیا ہے، وہاں یہی اسلوب ملحوظ ہے، مفصل بحث "کتاب الاسالیب[1]" میں ملے گی، یہاں ہم صرف قرآن مجید سے بعض مثالیں نقل کریں گے۔"

فرمایا ہے:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ لِيُرِيَكُمْ مِّنْ اٰيٰتِهٖ

نہیں دیکھتے کہ کشتیاں سمندر میں چلتی ہیں اللہ کے فضل سے تاکہ تم کو اپنی نشانیوں کا مشاہدہ کرائے۔

(لقمان - ۳۱)

اس آیت میں کلام، واحد کے صیغہ (الم تر) سے شروع ہوا لیکن پھر "لیریکم" میں

---

[1] یہ مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک معرکۃ الآراء تصنیف ہے، جس میں قرآن مجید کے بیشتر اسالیب اور ان کی خصوصیات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، یہ کتاب "اسالیب القرآن" کے نام سے چھپ چکی ہے اور دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

جمع کی ضمیر آگئی، کیوں کہ واحد سے مقصود درحقیقت جمع ہی تھی۔

دوسری جگہ ہے:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ۝

نہیں دیکھتے کہ خدا نے آسمانوں اور زمین کو ایک غایت کے ساتھ پیدا کیا ہے اگر وہ چاہے تو تمہیں فنا کر دے اور تمہاری جگہ نئی مخلوق بسائے۔

(ابراھیم - ۱۹)

اس آیت میں وہی اصول ملحوظ ہے، کبھی اس کے برعکس جمع سے کلام شروع ہوتا ہے اور پھر واحد کی ضمیر آجاتی ہے لیکن اس سے مقصود وہی جمع ہوتی ہے۔ مثلاً:

هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ ۝ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ۝ يُّلْقُوْنَ السَّمْعَ وَاَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ ۝ وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ۝ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ۝

میں تمہیں بتاؤں کہ شیاطین کن پر اترتے ہیں؟ وہ جھوٹوں اور گنہگاروں پر اترتے ہیں وہ کان لگاتے ہیں، حالانکہ اکثر جھوٹے ہوتے ہیں اور شعراء کی پیروی تو گمراہ لوگ کرتے ہیں۔ نہیں دیکھتے کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔

(شعراء - ۲۲۱ تا ۲۲۵)

کلام شروع ہوا (انبئکم) ضمیر خطاب جمع سے اور پھر "الم تر" واحد کا صیغہ آگیا[1]۔

اگر بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ "رمی" کا لفظ "طیر" کے لیے عربی زبان اور کلام مجید میں کہیں اور بھی استعمال ہوا ہے۔ ہمارے محدود مطالعہ کی حد تک کلام عرب میں اس کی کوئی مثال موجود نہیں ہے کہ "طیر" کے لیے "رمی" کا لفظ استعمال ہوا ہو۔ "رمی" کے معنی کسی چیز کو طاقت سے دور پھینکنے کے آتے ہیں، چنانچہ لسان العرب میں ہے:

قال المبرد معناه ما رميت بقوتك اذ رميت ولكن بقوة الله رميت[2]

مبرد نے کہا کہ "ما رمیت اذ رمیت" کا معنی یہ ہے کہ تم نے اپنی قوت سے کنکری نہیں پھینکی بلکہ اللہ کی قوت سے پھینکی۔

[1] تفسیر سورۂ فیل ص ۱۳-۱۴ (از مولانا فراہی) مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مولانا فراہی کی اسالیب القرآن۔

[2] لسان العرب ج ۴ ص ۳۳۵

ظاہر ہے کہ رمی چھوٹی چھوٹی چڑیوں کی چونچ اور چنگل سے نہیں ہوسکتی، دلچسپ بات یہ ہے کہ جن روایتوں میں اس کا ذکر ہے کہ چڑیوں کے چونچ اور چنگل میں چنے کی دال کے برابر سنگریزے تھے، خود ان میں بھی ان کے کنکریاں پھینکنے کے لیے 'رمی' کے بجائے 'القت' اور 'ارسلت' کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں اور 'رمت' کا لفظ نہیں استعمال ہوا، خود بہت سے قدیم مفسرین کو بھی یہ لفظ کھٹکا ہے، چنانچہ انھوں نے اس کی عجیب و غریب تاویل کی ہے کہ چڑیاں مڑکر اور عجیب ڈھنگ سے اپنے چونچ اور چنگل کو گھما کر دانوں کے برابر سنگریزے گراتی تھیں[1]۔ پس عربیت کا ذوق اس سے قطعاً ابا کرتا ہے کہ چڑیوں کے لیے 'رمی' کا لفظ استعمال ہوا اور 'ترمی' کا فاعل انہیں مانا جائے۔

ساتواں اعتراض

اب مولانا میرٹھی کا ساتواں اعتراض ملاحظہ ہو۔

"مولانا فراہی نے ابرہہ کے لشکر کا بے مثال شجاعانہ دفاع کرنے کا تمغہ اہل مکہ کے علاوہ ان حاجیوں کو بھی عطا فرمادیا ہے جو اس سال حج کے لیے آئے تھے، حالانکہ اس وقت مکہ میں باہر سے آئے ہوئے کسی حاجی کے رہنے کی بات کرنے کے لائق نہیں ہے، باہر سے آئے ہوئے حاجی تو تیرھویں، چودھویں ذی الحجہ کو اپنے اپنے وطن کو واپس ہو جاتے تھے اور ابرہہ کا لشکر ماہ محرم میں وادی محسر پہنچا تھا۔"

مولانا کے اس اعتراض کا وزن اس وقت تسلیم کیا جاسکتا ہے جب قطعی طور پر یہ ثابت ہوجائے کہ واقعہ فیل ماہ محرم ہی میں پیش آیا تھا، جبکہ اس سلسلہ میں متعدد اقوال منقول ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے چالیس روز قبل یہ واقعہ پیش آیا۔ ایک قول پچاس روز قبل کا ہے۔ ان کے علاوہ پندرہ سال قبل، تیئس سال قبل، تیس سال قبل یہاں تک کہ چالیس سال قبل اور ستر سال قبل ولادت تک کے اقوال موجود ہیں[2]۔ انھی میں سے ایک کو ترجیح دے کر مولانا فراہی بڑے وثوق اور اعتماد کے ساتھ لکھتے ہیں کہ "علمائے سیر کے بیان کے مطابق ابرہہ کا حملہ موسم حج

---

[1] تدبر القرآن ج ۸ ص۶۱۵ (از مولانا امین احسن صاحب اصلاحی)

[2] دیکھیے روح المعانی جز ۳۰ ص۲۳۳، تفسیر خازن ج ۷ ص۲۴۵، لبغوی کی معالم التنزیل برحاشیہ خازن طبع مصر ۱۳۳۳ اور الدر المنثور ج ۶ ص۳۹۵ وغیرہ۔

میں پیش آیا تھا[1]۔ گو اس موقع پر انھوں نے اس کے لیے کوئی حوالہ نہیں دیا ہے، مگر ان سے ہرگز یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ کوئی بے سروپا اور بے بنیاد بات لکھیں گے، ممکن ہے مولانا کے ذہن میں حوالہ موجود رہا ہو لیکن اپنی یادداشت پر اعتماد کے سبب اس کو درج نہ کرسکے ہوں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ مولانا نے مختلف اقوال و قرائن سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہو کہ واقعہ فیل حج کے موسم میں پیش آیا تھا، جیسا کہ خود اہل عرب کے بیانات سے اس کا اشارہ ملتا ہے جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

تاریخ و سیر کی کتابوں میں تلاش و جستجو کے باوجود سردست ہمیں مولانا فراہی کے اس قول کا حوالہ تو دستیاب نہیں ہوسکا مگر جن لوگوں نے واقعہ فیل کا زمانہ، ماہ محرم، بتایا ہے ان کا ماخذ صرف محمد بن اسحاق کی بیان کردہ روایات ہیں، ظاہر ہے کہ ایسے اہم اور عظیم الشان واقعہ کے ثبوت کے لیے تنہا ایک شخص کی روایات کافی نہیں ہوسکتیں، وہ بھی ایسے شخص کی جس کی بہت سے اہل فن نے تضعیف بھی کی ہو، چنانچہ علامہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ محمد بن اسحاق کے بارے میں تہذیب التہذیب جلد ۹ میں لکھتے ہیں:

۱- وقال مالک، دجال من الدجاجلۃ (ص۴۱)	امام مالک نے فرمایا کہ (محمد بن اسحاق) دجالوں میں سے ایک دجال ہے۔
۲- وقال البخاری، ایضا محمد بن اسحق ینبغی ان یکون لہ الف حدیث ینفرد بہا (ص۴۲)	اور امام بخاری نے فرمایا کہ محمد بن اسحاق تقریباً ایک ہزار احادیث میں منفرد ہیں۔
۳- وقال یعقوب بن شعبۃ سمعت ابن نمیر یقول .... وانما اتی انہ یحدث عن المجہولین احادیث باطلۃ (ص۴۲)	یعقوب بن شعبہ کہتے ہیں کہ میں نے ابن نمیر سے سنا، وہ کہتے تھے کہ .... محمد بن اسحاق مجہول لوگوں سے باطل اور بے بنیاد روایتیں بیان کرتے تھے۔
۴- وقال احمد بن حنبل کان محمد بن اسحق یدلس (ص۴۳)	امام احمد نے فرمایا کہ محمد بن اسحاق تدلیس کیا کرتے تھے۔
۵- وقال عباس الدوری عن ابن	عباس دوری ابن معین سے نقل کرتے ہیں کہ

---

[1] تفسیر سورہ فیل ص۵۲ ۱۹۳۷ء

معین محمد بن اسحٰق ثقة و لیس بحجة (ص۴۳)
محمد بن اسحاق ثقہ تو ہیں مگر حجت نہیں۔

۶۔ وقال ابن المدینی ثقة لم یضعه عندی الا روایته عن اهل الکتب[1] (ص۴۵)
ابن مدینی نے کہا کہ محمد اسحاق ہیں تو ثقہ مگر میرے نزدیک ان کا کوئی درجہ نہیں ہے، اس لیے کہ وہ اہل کتاب سے روایتیں لیتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ محتاط علماء و مفسرین اور ارباب سیر و تاریخ اس مسئلہ میں بالکل خاموش ہیں اور جن لوگوں نے اس کا ذکر بھی کیا ہے تو انھوں نے مہینہ کی کوئی صراحت نہیں کی ہے، مثلاً امام فخرالدین رازی وغیرہ لکھتے ہیں :

لم یکن بین عام الفیل و مبعث الرسول الا نیف واربعون سنة[2]
عام الفیل اور بعثت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مابین چالیس سال اور کچھ مہینہ کا وقفہ تھا

اس کے مقابلہ میں مولانا فراہیؒ کے خیال کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ عکرمہ بن ہاشم بن عبد مناف نے صراحتہً اپنے شعر میں یہ کہا ہے کہ ابرہہ کے آدمی قربانی کے کچھ اونٹ بھی ہنکا کر لے گئے تھے چنانچہ وہ کہتا ہے :

لاهم اخز الاسود بن مقصود الاخذ الهجمه فیها التقلید
خداوندا اسود بن مقصود کو رسوا کر جو قربانی کے اونٹوں کو جن کی گردنوں میں قلادے تھے ہنکا لے گئے۔

بین حراء و ثبیر فالبید یحبسها وهی اولات التطرید
حراء، ثبیر اور بید کے درمیان ان کو روکا اور وہ ہنکالے جانے کے لیے تھے

فضمها الی طماطم سود اخفره یارب وانت محمود[3]

---

[1] ہم نے یہ چند اقوال اس لیے نقل کر دیے ہیں تاکہ یہ ذہن میں رہے کہ واقعہ فیل میں چڑیوں کے پتھر مارنے کی تمام روایتیں انہی محمد بن اسحاق کی بیان کردہ ہیں اور ان سے پہلے کسی راوی کا پتہ نہیں، ویسے اس کتاب میں ان کے غیر معتبر ہونے کے اور بھی بہت سے اقوال ہیں اور ساتھ ہی ان کی ثقاہت کے بھی بہت سے اقوال موجود ہیں مگر امام بخاری اور دوسرے ائمہ حدیث انہیں بالکل ناقابل اعتماد سمجھتے ہیں۔

[2] تفسیر الفخر الرازی ج ۳۲ ص۹۷ [3] تفسیر سورۂ فیل ص۵۲ ۱۹۳۶ء

پھر ان کو حبشی غلاموں کے حوالہ کیا، خداوند! ان کو اپنی مال سے محروم کردے، تو سزاوار حمد ہے۔

ابن جریر طبری اور بعض دوسرے مورخین کے بیان میں بھی یہ صراحت ملتی ہے :

ولما نزل ابرهة المغمس .... وهت قریش وکنانة ومن کان معهم بالحرم من سائر الناس بقتاله[1]
اور جب ابرہہ وادی مغمس میں خیمہ زن ہوا ... اور قریش، قبیلہ کنانہ، قبیلہ ہذیل اور وہ تمام لوگ جو اس وقت ان کے ساتھ حرم میں موجود تھے سب نے ابرہہ سے مقابلہ کی ٹھان لی۔

روایت کے الفاظ " ومن کان معهم بالحرم من سائر الناس " خاص طور پر غور طلب ہیں، قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اطلاق دس بیس آدمیوں کے بجائے ایک جم غفیر ہی پر ہو سکتا ہے، اگر یہ واقعہ ماہِ محرم کا ہے جب کہ موسمِ حج ختم ہو چکا تھا اور مکہ اور اس کے قریب بازار، عکاظ اور ذی المجنہ وغیرہ بھی بند ہو گئے تھے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کون لوگ اس وقت حرم میں آ گئے تھے ؟ ظاہری بات ہے کہ یہ حجاج کرام ہی ہو سکتے تھے دوسرے نہیں، ورنہ پھر " من سائر الناس " کا کیا مطلب ہوگا۔

ایک اور پہلو بھی قابلِ غور ہے، سورۂ فیل میں ہے " الم یجعل کیدهم فی تضلیل یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کی مخفی چالوں کو ناکام بنا دیا، اب یہاں پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ مخفی چال کیا تھی ؟ اس کا جواب مولانا فراہی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے[2]

" قرآن مجید میں تصریح ہے کہ اصحاب فیل نے ایک مخفی تدبیر (کید) کی تھی، لیکن روایات میں اس کے حملہ کے جو وجوہ بیان کیے گئے ہیں، ان میں مخفی تدبیر کا کوئی پہلو نہیں ہے، وہ قوت کی نمائش اور عرب کی تذلیل کی ایک کھلی ہوئی کارروائی ہے، البتہ قابلِ اعتماد روایات سے استنباط کرنے کے بعد کید (مخفی تدبیر) کے چند پہلو سامنے آتے ہیں، مثلاً

۱۔ اس نے اشہرِ حرم میں حملہ کیا، کیونکہ اس کو خیال تھا کہ عرب ان مہینوں میں جنگ و خونریزی

---

[1] تفسیر ابن جریر ج ۳۰ ص ۳۰۱

[2] دیکھیے اس عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کی عام کتابوں میں جو واقعات بیان ہوئے ہیں مولانا فراہی نے ان پر اعتماد نہیں کیا ہے، بلکہ دوسری روایتوں پر اعتماد کیا ہے اور وہیں سے یہ بات لی ہے کہ واقعہ فیل موسم حج میں پیش آیا تھا، تحقیق کے بعد اگر اس ماخذ کا پتہ چل گیا تو ان شاء اللہ ہم اس پر الگ سے لکھیں گے۔

سے احتراز کرتے۔

۲۔ اس نے مکہ میں ایسے وقت داخل ہونا چاہا جب تمام اہلِ مکہ دوسرے عربوں کے ساتھ حج میں ہوتے تھے۔

۳۔ اس نے خاص طور پر ایام تشریق میں حملہ کرنا چاہا کہ عرب یا تو منیٰ میں مقیم ہوں یا سفر کے تھکے ہارے گھروں کو واپس آرہے ہوں گے۔

ان باتوں کو پیشِ نظر رکھ کر اب غور کرو کہ خداوند تعالیٰ نے ان کی چالوں کو کس طرح برباد کردیا۔

۱۔ ان کی فوج کو بطن محسر ہی میں روک دیا۔

۲۔ محسر کے پتھروں سے عربوں نے اسلحہ کا کام لیا۔

۳۔ خدا نے آسمان سے سنگریزے برسانے والی آندھی بھیجی۔

ان تفصیلات سے ظاہر ہوتا ہے کہ واقعۂ فیل کا موسم حج میں پیش آنا زیادہ قرینِ قیاس ہے، کیونکہ اس سے زیادہ بہتر اور موزوں توجیہ کوئی اور نہیں بنتی۔ مولانا میرٹھی صاحب کی نظر 'کید' کے نکتہ کی جانب نہیں کی گئی، اس لیے انھوں نے اس کی مراد سے کوئی بحث نہیں کی، چنانچہ ان کی بیان کردہ تفصیلات میں اس مخفی تدبیر کا کہیں نام و نشان نہیں ملتا۔ مولانا نے "کید" کا ترجمہ "منصوبہ" کیا ہے، اس کے باوجود ہمارا سوال اپنی جگہ برقرار ہے، کیوں کہ منصوبہ بھی دو طرح کا ہوتا ہے، ایک پوشیدہ اور ایک ظاہر، اور جب اس کے لیے 'کید' استعمال کیا جائے گا تو اس سے پوشیدہ منصوبہ ہی مراد ہوگا، نہ کہ ظاہر۔

آٹھواں اعتراض :

مولانا بشیر احمد صاحب میرٹھی اپنے آٹھویں اعتراض کے تحت تحریر فرماتے ہیں :

"مولانا فراہیؒ نے، سنا ہے کہ جاہلیت کے شعراء و خطباء کے کلام کا بڑا گہرا مطالعہ فرمایا تھا اور عربی زبان سے کما حقہ واقفیت کے لیے اس کا مطالعہ بلاشبہ نہایت مفید ہے، لیکن اس مطالعہ کی وجہ سے مولانا کے ذہن میں جاہلیت کے عربوں کی جو اخلاقی تصویر مرتسم ہوگئی تھی وہ صحیح نہ تھی۔ مولانا فراہیؒ کے گمان میں عام اہلِ عرب شجاعت، سخاوت، خودداری و عزتِ نفس میں دیگر ممالک کے باشندوں سے فائق و ممتاز تھے۔ یہ سراسر غلط ہے۔ کسی قبیلہ میں اکا دکا اشخاص ایسے بلند اخلاق ہوں تو ہوں، عام اہلِ عرب

ایسے نہ تھے۔ وہ بہادر تھے آپس میں قتل و غارت کرنے کے لیے، لیکن عجمی اقوام یعنی ایرانیوں اور رومیوں، حبشیوں اور مصریوں سے ایسے ہی مرعوب تھے جیسے انگریزوں کے دور میں ہندوستان کے باشندے انگریزوں سے مرعوب رہا کرتے تھے، وہ حد درجہ لالچی اور کنجوس تھے، اپنے یتیموں پر بھی انہیں رحم نہیں آتا تھا، دیگر مسکینوں کا ذکر ہی کیا۔ ان کے شعراء نہایت جھوٹے ہوتے تھے ۔۔۔ پس یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ اہلِ مکہ نے ابرہہ کے لشکر پر سنگ باری کرنے کی جرأت کی تھی"۔

ہمیں پھر افسوس کے ساتھ عرض کرنا پڑ رہا ہے کہ مولانا میرٹھی کا یہ اعتراض بھی عربوں کی صحیح عادات و خصائل سے بالکل عدمِ واقفیت کا نتیجہ ہے، یا پھر مولانا اپنے مخصوص نظریات کی تائید و حمایت میں، جاہلی عربوں سے متعلق تاریخی حقائق اور واقعات سے بالارادہ چشم پوشی کر رہے ہیں۔

جاہلی عربوں کی جو تاریخ محفوظ ہے، اس کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ قریش اور بنو اسماعیل کا تمام تر سرمایۂ فخر و نیاز ہمیشہ شہسواری، شمشیر زنی، قدر اندازی اور فیاضی و مہمان نوازی رہی ہے، یہاں تک کہ غیروں نے بھی اعتراف کیا ہے کہ اسی جوہر کی بدولت انھوں نے کبھی اپنی آزادی پر آنچ نہ آنے دی، ان کے اس مسلّم شرف کو معقول دلیل و شہادت کے بغیر نہ ماننا، ان کو گیدڑوں سے تشبیہ دینا اور حد درجہ لالچی اور کنجوس بتانا بڑی جرأت کی بات ہے، ہم مولانا کے اس اعتراض کو تین حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔

۱۔ یہ سراسر غلط ہے کہ عام اہلِ عرب شجاعت، سخاوت، خودداری و عزتِ نفس میں دیگر ممالک کے باشندوں سے فائق تھے، وہ رومیوں، ایرانیوں وغیرہ سے ایسے ہی مرعوب تھے جیسے انگریزوں کے دور میں ہندوستان کے باشندے انگریزوں سے مرعوب تھے۔

۲۔ وہ حد درجہ لالچی اور کنجوس تھے، اپنے یتیموں پر بھی انہیں رحم نہ آتا تھا۔

۳۔ ان کے شعراء نہایت جھوٹے ہوتے تھے۔ (مولانا میرٹھی)

ان میں سے ہر دعویٰ کے بالمقابل ہم علماء محققین اور نامور مورخین کی شہادتیں پیش کرتے ہیں۔ سب سے پہلے ہم مشہور مستشرق عالم ڈاکٹر گستاولیبان کی شہرۂ آفاق کتاب 'تمدنِ عرب' سے دو اقتباسات نقل کرتے ہیں جو علی الترتیب پہلے اور دوسرے اعتراضات کو رد کرنے اور عربوں کے اصل روپ کو سامنے لانے کے لیے کافی ہیں :

۱۔ "یونانی چوتھی صدی قبل مسیح سے بھی پہلے سے عربستان سے واقف تھے اور اس ملک

کی دولت نے اسکندر کو اس کے فتح کرنے پر آمادہ کیا۔ نیار کس[1] نے جزیرہ نمائے عرب کے گرد جو بحری فوج کشی کی اس کا نتیجہ عنقریب ظاہر ہونے والا تھا۔ لیکن اسکندر کی دفعتاً موت نے اسے روک دیا۔۔۔ لیکن جس وقت انٹیگونس[2] شام اور فینیشیا پر قابض ہوگیا، اس نے اپنے ایک سربرآوردہ سپہ سالار کو نبطیوں کے مقابلہ میں بھیجا، یہ سپہ سالار حملہ ناگہانی کرکے پیٹرا پر قابض ہوگیا، لیکن اس کی ساری فوج جس کی تعداد چار ہزار چھ سو تھی بالکل برباد ہوگئی۔ اس کے بعد اینٹگونس نے اپنے بیٹے ڈمٹریس کو ان کے مقابل بھیجا۔ ہیرودوط لکھتا ہے کہ جس وقت ڈمٹریس پیٹرا میں پہنچا تو عربوں نے اسے یہ کہا "اے شاہ ڈمٹریس تو ہم سے کیوں لڑتا ہے، ہم ایک ایسے بیابان کے رہنے والے ہیں جہاں شہر والوں کو مایحتاج مطلق نہیں مل سکتیں، ہم نے ایک اس قسم کے بے پیداوار ملک میں رہنا اسی وجہ سے اختیار کیا ہے کہ ہم ہرگز غلام بننا نہیں چاہتے۔۔۔ اگر تو محاصرہ کو طول دینا چاہتا ہے تو بہت جلد تجھے ہر قسم کی تکالیف کا سامنا کرنا پڑے گا، اور تو ہرگز ہمیں مجبور نہیں کر سکے گا۔"۔۔۔ ڈمٹریس نے اس صلح کے پیغام کو غنیمت جانا اور خوشی خوشی تحائف لے کر ایک ایسی لڑائی کو ختم کر دیا جس میں اسے سخت مشکلات معلوم ہو رہی تھیں۔۔۔"

ان کی (عربوں) لوٹ مار اور ان کی چڑھائیوں پر روم کے شاہنشاہوں کو جن کا ملک دریائے فرات تک پہنچ گیا تھا، سخت غصہ آیا اور انہوں نے ان کی گوشمالی کے لیے عربستان کوہستانی پر کئی لشکر کشیاں کیں، لیکن اس کا نتیجہ اسی قدر ہوا کہ یا تو چند روزہ خراج وصول ہوا یا چند روز کے لیے جنگ و جدل موقوف ہوگئی۔ یہ بدوی اقوام اس وقت بھی اسی طرح جنگ کرتی تھیں جیسے اب کرتی ہیں۔"

شاہنشاہ آگسٹس[3] اس دولت کے لالچ میں جو سالہا سال سے یونانی اور رومی مورخین کے متخیلوں میں بھری ہوئی تھی، ایک چڑھائی یمن پر کی، لیکن یہ مطلق سرسبز نہ ہوئی

---

[1] یہ اسکندر کا سپہ سالار تھا۔

[2] یہ بھی سکندر کے سپہ سالاروں میں تھا اور شام اور فینیشیا کا ملک اس کو ملا تھا۔

[3] آگسٹس سب سے پہلا شاہنشاہ روم تھا، اس کے وقت میں روم کی سلطنت جمہوری کا خاتمہ ہوا اور بادشاہت قائم ہوئی، سال ولادت ۶۳ ق م اور سال وفات ۱۴ء ہے۔

اور شاہنشاہ ٹائی بیریس[1] کے زمانہ میں البتہ اتنا ہوا کہ عربستان کا ایک چھوٹا سا گوشہ جہاں اکثر بدوی اقوام رہتی تھیں، چند روز کے لیے فتح ہوگیا۔"

جس وقت رومیوں کا دارالسلطنت قسطنطنیہ میں آیا، اس وقت عربوں نے دریائے فرات کی حکومت کے لیے ایرانیوں اور یونانیوں کا مقابلہ کیا۔

اس مختصر کیفیت سے ثابت ہوتا ہے کہ باستثنائے سرحدات شمالی عربستان بالکل غیر اقوام کی فتوحات سے محفوظ رہا۔ وہ بڑے بڑے مصری، یونانی، رومی اور ایرانی وغیرہ ملک گیر جنہوں نے تمام دنیا کو تہ و بالا کر دیا، عربستان کا کچھ بھی نہ کر سکے، اور اس عظیم الشان جزیرہ نما کا دروازہ مطلق بند رہا۔۔۔ کہا جا سکتا ہے کہ دنیا کے تمام مہذب ملکوں میں عربستان ہی کا ملک ہے جس کا بڑا حصہ غیر اقوام کی حکومت سے بچا رہا ہے[2]۔"

۲- "ڈیوزی لکھتا ہے کہ عربوں کے خصائص میں شاید وہ خاصیت سب سے زیادہ نمایاں ہے جو لوٹنے کے ولولہ اور مہمان نوازی کے جوش سے مل کر پیدا ہوئی ہے، غارت گری کا اشتیاق اور اس کے ساتھ فیاضی، شدید بے رحمی اور پھر کشادہ دلی وہ خاصیتیں ہیں جو ان کے اوصاف اضداد کو ہمارے سامنے لاتی ہیں اور ایک ہی تقریر میں ایک ہی شخص کی نسبت میں مرتبہ ہم سے آفریں اور نفریں کہلواتی ہیں۔۔۔ ہمیں ایسے خصائص قبیحہ کے ساتھ ہرگز ہمدردی نہ ہوتی، اگر انہی کے مقابل میں اعلیٰ درجے کے اوصاف بھی نہ ہوتے، وہی کارزار جس کے ہاتھ سے لوٹ کے اشتیاق یا غیرت کے جوش میں شدید سے شدید بے رحمی کے افعال سرزد ہوتے ہیں، جس وقت اپنے خیمہ میں بیٹھتا ہے تو ایک مہربان میزبان بن جاتا ہے، اور اعلیٰ تواضع سے پیش آتا ہے جو کوئی مصیبت زدہ ان کی پناہ میں آگیا، جس نے ان کی حمیت پر بھروسہ کیا تو پھر اس کی مدارات دوستوں کی سی نہیں ہوتی" بلکہ عزیزوں اور قرابت داروں کی سی، اس مہمان کی جان مقدس و محترم ہو جاتی ہے اور میزبان کو اس حفاظت خود اپنی جان پر کھیل کر بھی واجبات سے ہوتی ہے۔ اگرچہ اس پر یہ کیوں نہ ثابت ہو جائے کہ جو شخص اس کی پناہ میں بیٹھا ہے'

---

[1] ٹائی بیریس دوسرا شاہنشاہ روم اور آگسٹس کا بیٹا تھا۔ سال ولادت ۴۲ ق م سال وفات ۳۷ء ہے۔

[2] تمدن عرب صفحہ ۸۰ - ۸۳ مطبوعہ اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۸۵ء۔

یہ وہ دشمن جانی ہے جس کی تباہی کی وہ سو بار آرزو کر چکا ہے، اسے شاید اس میں بھی تامل نہ ہوگا کہ مراسم مہمان داری کو عمدہ طور پر اور کشادہ دلی سے ادا کرنے کے لیے اپنے ہمسایہ کا اونٹ بزورِ چھین لائے یا حسن تقریر سے مانگ لائے[1]۔

ان دونوں بیانات کو پیش نظر رکھ کر مولانا کے دونوں الزامات کا جائزہ لیجیے اور خود فیصلہ کیجیے کہ کیا مولانا کا بیان صحیح ہے یا ان مورخین کا اعترافِ حقیقت، جن کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ عربوں، مسلمانوں اور اسلام کی ایسی تصویر کشی کریں کہ ساری دنیا ان سے متنفر ہو جائے اور انہیں حقیر، ذلیل اور رسوا سمجھنے لگے؟ عزیزوں کے یہ دونوں اقتباسات نمونہ کے طور پر پیش کیے گئے ہیں ورنہ تاریخ عرب کی تمام کتابیں عربوں کی غیرت و حمیت، عزت و خودداری، حلم و بردباری، ہمت و دلیری، شجاعت و بہادری، شہسواری و شمشیر زنی اور حریت پسندی نیز ان کی فیاضی و مہمان نوازی، پڑوسیوں کی حفاظت اور غریبوں اور مسکینوں کی اعانت کے تذکرے سے بھری پڑی ہیں۔

۳- اب ڈاکٹر یحییٰ جبوری استاذ جامعہ قطر کی اہم تصنیف 'الشعر الجاہلی' کی ایک عبارت کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔

اشعار کو عربوں کے یہاں بڑی اہمیت حاصل تھی، کیونکہ یہ عربوں کے مفاخر، مآثر اور ان کے اوصاف میں شامل تھے، اشعار صاحب کلام کی نفسیات، مناقب، بہادری، دلیری، جنگجوئی، غم و غصہ، خوشی و مسرت، جود و سخا اور عدل و وفا جیسے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں اور اچھی بری عادتوں کو واضح کرتے ہیں۔ یہ اشعار صاحبِ کلام کی زندگی اور ان کے گرد و پیش کے واقعات، حادثات اور ان کے حسب و نسب اور ان کی زندگی کے مختلف ادوار اور واقعات کی معرفت انہی اشعار سے حاصل ہوتی ہے اس لیے یہ عربوں کا دیوان (تاریخ)، ان کی حکمت کا مخزن اور ان کے علم و ادب کے گنجینے ہیں، جب کبھی وہ عزت و رفعت اور نصرت و ظفر مندی سے ہمکنار ہوتے یا کوئی اہم واقعہ پیش آتا تو فوراً اسے اپنے قصیدہ میں نظم کر لیتے تھے کہ قصیدہ ہی ان کے نزدیک سب سے زیادہ دیرپا اور محفوظ رہنے والی چیز تھی، ان کے نزدیک اپنے کارناموں کو محفوظ رکھنے کا یہی طریقہ تھا[2]۔ جاحظ کی کتاب 'الحیوان' میں ہے "دنیا کی ہر قوم اپنے مآثر و محاسن اور کارناموں کی بقا اور حفاظت

---

[1] تمدن عرب ص ۵۷-۵۸ [2] کتاب الصناعتین ص ۱۳۸

کے لیے کوئی نہ کوئی طریقہ ضرور اختیار کرتی ہے۔ دورِ جاہلیت کے عرب اپنے کارناموں کی حفاظت کے لیے موزوں کلام پر اعتماد کرتے تھے، چنانچہ ان کا کلام ہی ان کا دیوان ہے[1]۔" ابن عبدالسلام کا بھی یہی خیال ہے کہ شعر ہی دورِ جاہلیت کا دیوان، ان کے علم و حکمت کا منتہیٰ اور ان کی معلومات کا خزانہ تھا اور جب باہم مفاخرت کا موقع آتا تھا تو اسی کی طرف مراجعت کرتے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے کہ "شعر ایک ایسی قوم کا علم ہے جس کے یہاں اس سے زیادہ صحیح کوئی دوسرا علم نہیں تھا[2]۔"

یہ ہیں اشعارِ جاہلیت کے متعلق علماء و ادبا کے بیانات اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فرمان، اب آپ خود مولانا شبیر احمد صاحب کے اس دعویٰ کی صداقت کا فیصلہ کر سکتے ہیں کہ "ان کے شعراء نہایت جھوٹے ہوتے تھے[3]۔"

نواں اعتراض:

مولانا میرٹھی اپنے آخری اعتراض کے تحت رقم طراز ہیں:

"اگر اہلِ مکہ نے یہ عظیم الشان کارنامہ انجام دیا ہوتا تو شعرائے قریش نہایت فخر و

---

[1] کتاب الحیوان ۱/۷۱-۷۲

[2] طبقات الشعراء ص ۲۴

[3] ان بیانات کے نقل کرنے سے ہمارا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ عربوں کے اندر کوئی برائی تھی ہی نہیں بلاشبہ ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ ان کے اندر بہت سی خراب قسم کی خصلتیں بھی پائی جاتی تھیں جنہیں اسلام نے آکر دور کیا اور پھر اپنی برکت اور ان کے جوہر فاقی کی بدولت ان سے دنیا کی سیادت و قیادت اور حق کی رہنمائی کا کام لیا۔ فطرت کی اسی صالحیت اور فاقی ذہانت و قابلیت کی بنیاد پر ہی دنیا کی تمام متمدن اقوام کے بالمقابل انہیں عربوں کو اسلام جیسی عظیم تحریک کی امانت سونپی گئی، اس لیے کہ وہ ہی دراصل اس کے اہل تھے، عربوں کے محاسن و مثالب کا اگر طالب علمانہ طور پر فکر و نظر کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت نہایت واضح طور پر معلوم ہو جائیگی کہ ان کے معائب کا بڑا حصہ درحقیقت ان کو صحیح تربیت نہ ملنے کی وجہ سے تھا اور یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے کہ اگر کسی صالح اور زرخیز زمین کا کوئی ہوشیار مالی نہ ہو جو اس کی دیکھ بھال کرتا ہے، تو اس میں گل و لالہ کے ساتھ بیگانے پودے بھی بہت اگ آتے ہیں۔

مباہات کے ساتھ اس کا ذکر کرتے، اور قریش کی شجاعت اور بسالت کا اپنے قصیدوں میں وہ صور پھونکتے کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی، حالانکہ اس دور کے کسی بھی قریشی یا غیر قریشی شاعر نے لشکر ابرہہ کی تباہی کو انسانی شجاعت کا ثمرہ نہیں بتایا، جس شاعر نے بھی اس واقعہ کا ذکر کیا ہے"۔

یہ صحیح ہے کہ شعرائے قریش نے فخر و مباہات کے طور پر لشکر ابرہہ سے اپنی معرکہ آرائی کا بہت زیادہ ذکر نہیں کیا ہے، لیکن اس کے علاوہ عین وقت پر غول در غول چڑیوں کا نمودار ہونا اور مخصوص جماعت[1] پر ہی پتھر مارنا اور ان کو کھائے ہوئے بھس کی طرح بنا دینا بھی کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ مگر عرب شعراء نے اس کا بھی تو ذکر نہیں کیا ہے، لیکن ابرہہ کا لشکر چڑیوں کی سنگ باری سے تباہ ہوا ہوتا، تو عرب شعراء جہاں اس واقعہ کو محض اللہ کی آیت و قدرت اور اس کی غیبی مدد کے طور پر ذکر کرتے ہیں، وہیں چڑیوں کے اس عجیب و غریب اور غیر متوقع عمل کا بھی ذکر ضرور کرتے مگر ایسا نہیں ہے۔ مولانا میرٹھی صاحب نے جو اشعار نقل کیے ہیں یا جو دوسری کتابوں میں مذکورہ ہیں ان میں شعراء نے چڑیوں اور پتھروں کا ساتھ ساتھ ذکر کیا ہے لیکن یہ کہیں نہیں ہے کہ یہ پتھر چڑیوں نے پھینکے، بلکہ انھوں نے اس سنگ باری کو" حاصب اور ساف" کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ ابوقیس کہتا ہے:

فارسل من ربهم حاصب　　　يلفهم مثل لف القزم

پھر اللہ کی طرف سے ان پر 'حاصب' چلی جو خس و خاشاک کی طرح ان کو لپیٹ لیتی تھی۔

ابوقیس بن اسلت یثربی کہتا ہے:

فلما اجاز والبطن نعمان ردهم　　　جنود الاله بين ساف وحاصب[2]

[1] تفسیر ابن کثیر میں ہے فجاءت حتی صفت علی رؤسهم ج ۴ ص ۵۵۱، اسی طرح کے الفاظ روح المعانی میں بھی ہیں۔

[2] 'حاصب'، کا لفظ قرآن مجید میں بھی آیا ہے مفسرین نے اس کے معنی ایسی تند ہوا کے لیے ہیں جو زور اور شدت کی وجہ سے زمین سے کنکریاں اور سنگریزے اٹھا لیتی ہیں اور لفظ 'ساف' تو چڑیوں کے لیے کسی طرح بھی صحیح نہیں ہو سکتا، 'سافی' اس ہوا کو کہتے ہیں جو گرد و غبار، خس و خاشاک اور درختوں کی پتیاں اڑاتی ہوئی چلتی ہے۔

جونہی وہ بطن نعمان سے آگے بڑھے، خدا کی فوجوں نے 'ساف' اور 'حاصب' کے درمیان نمودار ہو کر ان کو پسپا کر دیا۔

ان اشعار میں چڑیوں کی سنگ باری کو نہ بیان کرنے کی وجہ اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ یہ واقعہ سرے سے ہوا ہی نہیں تھا۔

ایسا نہیں ہے کہ عربوں نے اپنی معرکہ آرائی کا بالکل ہی ذکر نہیں کیا ہے، دراصل ابرہہ کے ساتھ ان کی معرکہ آرائیوں کا ہر جگہ چرچا تھا۔ بعض شعراء نے اس پر فخریہ اشعار بھی کہے ہیں۔ غالباً مولانا ان سے ناواقف ہیں۔ اسی وجہ سے انھوں نے ایک بے بنیاد دعویٰ کر ڈالا۔ قدیم اسلامی شاعر ذوالرمہ کہتا ہے:

وابرهة اصطادت صدور رماحنا　　　جهارا وعثنون العجاجة اكدر

اور ہمارے نیزوں نے علانیہ ابرہہ کا شکار کیا اور فضا میں کثیف غبار کا ستون قائم تھا۔

تنحی له عمرو فشك ضلوعه　　　بنافذة نجلاء والخيل تضبر[1]

عمر نے اس کی طرف لپک کر نیزے کے کاری زخم سے اس کی پسلیاں توڑ دیں اور شہسوار ثابت قدم تھے

دیکھیے ان شعروں میں صراحت ہے کہ اس کی قوم کے ایک آدمی نے ابرہہ کو نیزہ بھی مارا اور یہ واقعہ کا بہت زیادہ ذکر اس لیے نہیں ہے کہ دراصل ان کی سنگ باری کے پردہ میں سخت آندھی اور طوفان کے ذریعہ ایسی شدید خدائی سنگ باری ہوئی کہ وہ بھاگنے پر مجبور ہو گئے اور جو نہ بھاگ سکے وہ وہیں چبائے ہوئے بھس کی طرح ہو گئے۔ یہ خدا کی قدرت کاملہ کا ایک عظیم الشان معجزہ تھا، ورنہ قریش کے لیے ابرہہ کے لشکر جرار کو پارہ پارہ کر دینا تو درکنار اس کو شکست دے دینا بھی آسان نہ تھا اس لیے شعرائے عرب نے اس واقعہ کو محض اللہ کی آیت و قدرت اور اس کی غیبی مدد کے طور پر ہی ذکر کیا ہے، یہ عربوں کی بلند ظرفی، ان کے اعلیٰ اخلاق اور حقیقت پسندی کی وہ کھلی ہوئی دلیل ہے جس کی بلا ثبوت مولانا تردید کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

اگر طوالت کا خوف دامن گیر نہ ہوتا تو ہم مولانا فراہی کی تفسیر سے ان اسباب کو بھی بیان کرتے جن کے باعث لوگوں کو 'ترميهم بحجارة من سجيل' کی تفسیر میں غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے، اور انھوں نے اس کی تاویل میں ان روایتوں پر اعتماد کر لیا جو بقول مولانا فراہی[2]

(باقی صـ۶۲ پر)

[1] تفسیر سورۂ فیل (مولانا فراہی ص۵)

عطاء الرحمان

مولانا فراہیؒ اور مولانا اصلاحی کے فکرِ قرآنی پر ایک نظر

نوائے وقت مورخہ ۸ر نومبر کی اشاعت میں ڈاکٹر محمود الحسن عارف نے جاوید الغامدی صاحب کے افکار کا محاکمہ کرتے ہوئے اس صدی کے ممتاز امام تفسیر علامہ حمید الدین فراہی اور ان کے شاگرد رشید مولانا امین احسن اصلاحی کی تفسیری آراء اور قرآنی آیات پر ان کے طرز استدلال کو بھی موضوع سخن بنایا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا پہلا اعتراض یہ ہے کہ علامہ فراہی اور مولانا اصلاحی دونوں نے "قرآن کو کتاب اللغۃ بنا کر رکھ دیا ہے جسے ہر شخص ڈکشنری کی مدد سے سمجھ ہی نہیں بلکہ سمجھا بھی سکتا ہے" اور یہ کہ "فراہی صاحب قرآن فہمی کے لیے جاہلی شاعری کو اساس قرار دیتے ہیں۔ جبکہ مدارس کے فارغ التحصیل علما حدیث وسنہ اور تصریحات اسلاف کو مدار فکر ٹھہراتے ہیں"... یہ اعتراض ہی بنیادی طور پر غلط ہے اور اگر ڈاکٹر صاحب یہ کلمات لکھنے سے پہلے مولانا اصلاحی کی معرکۃ الآرا تفسیر تدبر قرآن کا مقدمہ جس میں انھوں نے قرآن فہمی کے رہنما اصول متعین کئے ہیں پڑھ لیتے تو مجھے یقین ہے کہ ہرگز اس رائے کا اظہار نہ فرماتے۔

قرآن مجید کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کا یہ ارشاد بالکل درست ہے کہ "یہ محض عربی ادب کی کتاب نہیں جسے محض جاہلی شاعری کی مدد سے سمجھا جا سکے"۔ لیکن یہ بھی ایک واضح حقیقت ہے کہ یہ کلام الٰہی انسانوں کیلئے کتاب رشد و ہدایت کی حیثیت سے عربی زبان وادب کے پیراہن میں اُترا تھا اور اس کا ادبی معیار اب تک لاثانی ہے۔ یہ کتاب قریش مکہ کے محاورے اور لہجے میں نازل ہوئی تھی اور اس کی زبان و بیان کی باریکیوں اور فنی رموز سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے اس زمانے کے کلام عرب اور روزمرہ سے آشنائی ایک لازمی امر ہے۔ علامہ فراہی تو تیرھویں اور چودھویں صدی ہجری کے عالم تھے اور بُعد زمانی کی وجہ سے ان کا زمانہ بعثت کی زبان اور اس کے رموز سمجھنے پر اصرار باآسانی سمجھ میں آجانا چاہیئے لیکن حضرت عبداللہ ابن عباسؓ جنھوں نے تیرہ چودہ برس کی

عمر تک صاحب قرآن حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عہد دیکھا تھا اور جو عنفوان شباب پر پہنچتے قرآن کی قرآن فہمی کا عالم دیکھ کر سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ جیسا جلیل القدر صحابی اور خلیفہ راشد کہہ اُٹھا کہ "ابن عباسؓ اکابر کے طبقہ کے جوان ہیں، ان کو سوال کرنے والی زبان اور سمجھنے والا دل عطا ہوا ہے" اور جو خود قریش میں سے ایک تھے، وہ لہجہ اور زبان جس میں قرآن اُترا ہے ان کے گھر کی لونڈی تھی، وہی عبداللہ ابن عباسؓ آیات قرآنی کے مطالب سمجھاتے وقت بے تکان کلام جاہلیت سے مثالیں دیا کرتے تھے۔ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف الاتقان فی علوم القرآن میں جو عرب و عجم کے بیشتر دینی مدارس میں صدیوں سے لغت قرآن کے طور پر پڑھائی جا رہی ہے ایسے بیسیوں اشعار نقل کیے ہیں جن سے حضرت عبداللہ بن عباس نے قرآن مجید کے اشارات و کنایات سے لوگوں کو آشنا کرنے کے لیے استشہاد کیا ہے۔۔۔

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور ہرگز شعر و ادب کی کتاب نہیں بلکہ رموزات و حکمتِ الٰہی کا منبع ہے۔ قرآن سے مُراد اس کے الفاظ اور معانی دونوں ہیں۔ ایک کو دُوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ الفاظ کے معنی اور اسلوب بیان کے مختلف پہلو سمجھنے کے لیے اس دور کی زبان اور مطالب کی گہرائیوں میں اُترنے کے لیے حکمت قرآن سے جو خود قرآن کے اندر پوشیدہ ہے اور صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت و احادیث سے عیاں ہوتی ہے۔ واقفیت نہایت ضروری ہے۔ قرآن کے بارے میں خود اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ اسے عربی مبین میں اتارا گیا ہے۔ وہ عربی مبین کیا ہے۔ یہ وہ لہجہ اور روزمرہ ہے جسے صاحب وحی جناب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اس معاشرہ کے افراد بولا کرتے تھے جس میں حضورؐ مبعوث ہوئے۔ اہل عرب اور خصوصًا قریش کو اپنی زبان کی فصاحت و بلاغت پر بڑا ناز تھا۔ اس عہد اور معاشرے کے لوگ شعر و ادب کا بہت پاکیزہ مذاق رکھتے تھے اور ان میں سے بعض جو حضورؐ کے سخت مخالف تھے قرآن کی تلاوت سُن کر اس کی اعلیٰ تر زبان اور انداز بیان کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ لہٰذا آج کے طالب علوم قرآنی پر لازم ہے کہ اس دور کے شعر و ادب، اسالیب بیان اور روزمرہ سے کماحقہٗ واقفیت حاصل کرے۔ اسی طرح قرآنی ہدایات اور حکمتِ الٰہیہ سے مستفید ہونے کے لیے ضروری ہے کہ خود قرآن کے نفس مضمون پر غور کیا جائے۔ اس کی آیات کی بار بار تلاوت کی جائے، ان پر تدبر کیا جائے۔ حضرت محمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت اور احادیث سے پوری رہنمائی حاصل کی جائے بلکہ ان کا تتبع کیا جائے۔ یہ ہے مکتب فراہی کے اس اصُولِ تفسیر کا خلاصہ جس میں دورِ جاہلیت کے کلام عرب کو سمجھنے پر زور دیا جاتا ہے۔ رہی یہ بات کہ اس دور کا کلام بعد کی آمیزشوں سے پاک نہیں تو اس خامی سے کلام عرب سے واقفیت رکھنے والا کونسا شخص ہے جو واقف نہیں۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے اپنی تفسیر کے مقدمہ میں اس پر ان الفاظ میں اظہار خیال کیا ہے: "اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ زمانۂ جاہلیت کے شاعروں اور خطیبوں کے کلام کا بڑا حصہ دست برد زمانہ کی نذر ہو

گیا لیکن پھر بھی اتنا ذخیرہ موجود ہے کہ اصل مقصد کے لیے کفایت کرتا ہے۔ پچھلے پچاس سال میں بہت سے ایسے دواوین شائع ہو چکے ہیں جو پہلے ناپید تھے۔ شعراء کے کلام میں ایسے مجموعے بھی اب دستیاب ہیں جن میں کلامِ عرب کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ اگرچہ ان کے اندر منحول کلام بھی شامل ہے لیکن عربیت کا ذوق رکھنے والے آسانی سے ان کے خالص اور منحول میں امتیاز کر سکتے ہیں۔ خطبائے جاہلیت کے جواہر ریزوں کے لیے پہلے جاحظ، مبرد اور ابن حدید وغیرہ کی کتابوں کی خوشہ چینی کرنی پڑتی تھی، اب خطبات الگ الگ کر کے شائع کر دیئے گئے ہیں۔ غرض طالب اور قدر دان کے لیے تربیتِ ذوق کا کافی سامان موجود ہے۔"

آج شیکسپیئر کی شاعری کو سمجھنے کے لیے اگر یہ کہا جائے کہ اس دَور کی کلاسیکی انگریزی اور اس کے اسالیب سے واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے تو کسی کو تعجب نہیں ہوتا۔ برطانوی اور امریکی یونیورسٹیوں میں جہاں جہاں انگریزی کے اس نامور شاعر کے ڈرامے پڑھے اور پڑھائے جاتے ہیں وہاں پندرھویں اور سولھویں صدی عیسوی میں بولی جانے والی انگریزی زبان اور محاورے کے ماہرین اس کام کے لیے متعین ہیں۔ آج صاحبِ علم امریکی کیا انگریز بھی شیکسپیئر کی زبان پر محنت اور توجہ کئے بغیر عبور حاصل نہیں کر پاتا۔ نیوز ویک اور ٹائم اور یہاں تک کہ ان کا مسٹے کالب ولہجہ اس زبان سے قطعی مختلف ہے جس میں اس نابغۂ عصر نے اپنا کلام لکھا۔ اگر علامہ فراہی اور مولانا اصلاحی اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ قرآن کی عربی مبین کا ذوق پیدا کرنے کے لیے مصر و شام کے اخبارات و رسائل میں لکھی جانے والی دورِ جدید کی زبان نہیں، امرء القیس، لبید، زہیر اور عمرو بن کلثوم کی کلاسیکی عربی سے واقفیت لازمی ہے تو کونسی انوکھی بات کہتے ہیں۔

ڈاکٹر محمود الحسن صاحب نے بالکل غلط کہا ہے کہ مکتبِ فراہی میں قرآن فہمی کی اساس محض جاہلی شاعری پر رکھی گئی ہے۔ جاہلی شاعری پر صرف اور صرف عربی زبان و اسالیب کی فنی باریکیوں سے آشنا ہونے کے لئے زور دیا جاتا ہے۔ قرآن مجید کے نفسِ مضمون سے کماحقہ آگاہی حاصل کرنے کے لیے علامہ فراہی اور مولانا اصلاحی دونوں کے نزدیک تفسیر قرآن بالقرآن (ثم علینا بیانہ) تصریفِ آیات، قرآنی آیات میں باہمدگر ربط و نظم کی تلاش، سُنتِ متواتر و مشہورہ (یعنی صلوٰۃ، زکوٰۃ، صوم، حج، عمرہ، قربانی، مسجد حرام، صفا و مروہ، سعی طواف کے عملی طریقے اور یہ کہ قرآن مجید اور شریعت کی اصطلاحات کا مفہوم بیان کرنے کا حق صرف صاحبِ وحی محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے) احادیث نبویؐ اور آثار صحابہ بنیادی لوازم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ احادیث کے بارے میں مولانا اصلاحی مقدمہ تفسیر تدبر قرآن میں لکھتے ہیں: "تفسیر کے ظنی ماخذوں میں سے سب سے پاکیزہ چیز ذخیرہ احادیث و آثار صحابہ ہیں۔ حکمتِ قرآن کے مسائل میں مجھے جو مدد احادیث سے ملی ہے کسی دُوسری چیز سے نہیں ملی۔" اس کے بعد فراہی مکتبِ فکر میں سلف کی لکھی ہوئی تفاسیر قرآن خصوصاً تفسیر ابن جریر، امام رازی کی تفسیر کبیر اور علامہ زمخشری

کی کشاف سے بھرپور استفادہ کرنے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔ پھر قرآنی نقطۂ نظر سے قدیم آسمانی صحیفوں اور تاریخ عرب پر ناقدانہ نظر ڈالنے کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ معلوم نہیں ڈاکٹر محمود الحسن صاحب نے یہ بات کہاں سے اُڑا لی کہ فراہی صاحب قرآن فہمی کی اساس محض جاہلی شاعری کو قرار دیتے ہیں۔

مکتبِ فراہی پر ڈاکٹر صاحب کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ "ان دونوں حضرات نے قرآن اور علومِ قرآن پر جو کچھ لکھا ہے اس کے اصل ماخذ کا کہیں حوالہ نہیں دیا۔ اگر وہ ایسا کرتے تو پتہ چل جاتا کہ ان کے قرونِ اولیٰ کے اکابر آئمہ کون کون سے ہیں۔" یہ اعتراض بھی پہلے اعتراض کی مانند قطعی بے بنیاد ہے۔ علامہ فراہی اور مولانا اصلاحی ہر دو حضرات اپنی تحریروں میں قرآنی الفاظ و محاورات کے لغوی معنی متعین کرنے اور اشارات و کنایات کی وضاحت کے لیے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے تتبع میں کلامِ عرب سے استشہاد کرتے ہیں اور خصوصاً علامہ فراہی جگہ جگہ ان کی مثالیں دیتے ہیں۔ پھر جمہور علما کی مانند لسان العرب جیسی لغت سے مدد لیتے ہیں اور اس کا حوالہ دیتے ہیں۔ پھر قرآن کے نفسِ مضمون پر غور کرتے ہیں، ایک آیت کا مطلب سمجھنے کے لیے دوسری آیات سے مدد لیتے ہیں اور ان کے نظائر دیتے ہیں۔ آیت کا آیت سے ربط تلاش کرتے ہیں۔ یوں پوری سورہ کے معانی کو ایک مربوط نظام میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کا مرکزی مضمون متعین کرتے ہیں۔ پچھلی سورہ کا اگلی سے تعلق معلوم کرتے ہیں۔ آپ تفسیر تدبر قرآن پڑھیں تو معلوم ہوگا کہ قرآن کی ہر ہر سورہ کے مضامین ایک لڑی میں موتیوں کی مانند الہامی ترتیب کے ساتھ ایک دُوسرے سے جڑتے چلے جا رہے ہیں۔ پھر یہ دونوں حضرات عقائد کی تشریح اور عملی عبادات کے لیے سُنتِ رسُولؐ کا اتباع کرتے ہیں اور حکمتِ قرآن کی تفہیم کے لیے ذخیرہ احادیث سے سب سے زیادہ مدد لیتے ہیں۔

قرونِ اولیٰ کے آئمہ میں سے صحابہ کرام یعنی خلفائے اربعہ کے علاوہ عبداللہ بن مسعودؓ، زید بن ثابت، ابُو موسیٰ اشعریؓ، عبداللہ بن زبیرؓ اور خصوصاً عبداللہ بن عباسؓ کے آثار سے بار بار استفادہ کرتے ہیں۔ مکتبِ فراہی میں ابن جریر کی تفسیر کے مطالعے پر زور ہی دراصل اقوالِ صحابہ معلوم کرنے کے لیے دیا جاتا ہے۔ مجموعۂ تفاسیرِ فراہی اور تفسیر تدبر قرآن کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر محمود الحسن صاحب یہ کہہ کر بھی ایک خالص علمی اور تحقیقی فقہی مسئلہ پر اٹھنے والی بحث کو ابتذال کی سطح پر لے آئے ہیں کہ "فراہی صاحب اور اصلاحی صاحب پیغمبرِ اسلامؐ سے (معاذ اللہ) اختلاف کرتے ہوئے رجم کو غیر شرعی سزا قرار دیتے ہیں۔" یہ بہتانِ عظیم ہے جو ڈاکٹر صاحب نے ان بزرگوں پر لگایا ہے۔ مولانا اصلاحی اور ان کے شاگردوں نے اس مسئلہ پر کافی شرح و بسط کے ساتھ لکھا ہوا ہے۔ مولانا رجم کو ہرگز غیر شرعی سزا نہیں قرار دیتے۔ وہ صرف اس کا اطلاق جمہور علماء کی رائے سے ہٹ کر مخصوص قسم کے عادی مجرموں پر کرتے ہیں، ہر شادی شدہ زانی یا زانیہ

پر نہیں۔ اس پر ان سے اختلاف ہو سکتا ہے اور مختلف علماء نے کیا بھی ہے۔ مولانا اصلاحی کے پاس بھی اپنے مؤقف کے حق میں دلائل کی کمی نہیں ہے لیکن ان پر یہ الزام عائد کرنا کہ وہ سرے سے رجم کی سزا ہی کو غیر شرعی قرار دیتے ہیں علم اور علمی دیانت دونوں کے ساتھ زیادتی ہے۔ راقم الحروف کو متانت اور ثقاہت دونوں سے سخت شکوہ ہے کہ انہوں نے اس موقع پر ڈاکٹر صاحب کا ساتھ چھوڑ دیا۔

ڈاکٹر صاحب کا تیسرا اعتراض ان کے اپنے الفاظ میں یہ ہے کہ "مولانا فراہی اور مولانا اصلاحی سے شکایت اتنی ہے کہ انہوں نے اس بارے میں علمی صحت کا خیال نہیں رکھا اور یہ کہ وہ چور دروازوں سے معتزلی خیالات و افکار کی نشر و اشاعت چاہتے ہیں حالانکہ انہیں یہ کام کھلے دروازوں سے کرنا چاہئے تھا۔" بہتر ہوتا ڈاکٹر صاحب اتنا بڑا الزام عائد کرتے وقت صراحت کے ساتھ بتاتے کہ وہ کون سے معتزلی خیالات و افکار ہیں جن کی اشاعت ان دونوں بزرگوں نے کی ہے۔ دوسری صدی ہجری میں اٹھنے والی تحریک اعتزال انکارِ سنت اور مسئلہ خلق قرآن کی وجہ سے علمائے امت میں غیر مقبول رہی ہے۔ یہ لوگ منکرینِ سنت میں سے تھے جبکہ علامہ فراہی اور مولانا اصلاحی دونوں قائلینِ سنت میں سے ہیں۔ مولانا اصلاحی نے اپنی تحریروں میں ایک نہیں بیسیوں مقامات پر سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن مجید کے بعد شریعت اسلامی کا دوسرا اہم ترین ماخذ قرار دیا ہے۔ اس بارے میں ان کی شدت کا یہ عالم ہے کہ وہ غالباً برصغیر میں دورِ حاضر کے واحد عالم دین ہیں جنہوں نے امام مالکؒ کے تتبع میں تعامل اہلِ مدینہ کو سنت معلوم کرنے کا ایک ذریعہ قرار دیا ہے۔ احادیث کا سب سے پہلے مرتب کیا جانے والا مجموعہ موطا امام مالکؒ ان کی محبوب کتابوں میں سے ہے اور اس بات پر کبھی کبھی حیرت کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ اسے صحاح ستہ میں شامل نہیں کیا گیا۔ صحیح مسلم کو اس کی خوبی ترتیب کی بنا پر وہ بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ برسوں انہوں نے یہ کتب سبقاً سبقاً اپنے شاگردوں کو پڑھائی ہے۔ کیا ایسا آدمی معتزلہ کے مخصوص خیالات و افکار کا مؤید ہو سکتا ہے۔ معتزلہ کے اٹھائے ہوئے مسائل میں سے خلق قرآن والی بحث کو انہوں نے ہمیشہ لاحاصل بحث قرار دیا ہے۔ تحریک اعتزال کا دوسرا پہلو وہ کلامی مسائل ہیں جو یونانی

ل یاد رہے کہ ادارہ تدبر قرآن و حدیث کے قیام کے ساتھ ہی مولانا اصلاحی نے اصولِ تدبر حدیث پر متعدد لیکچر دیئے جو تدبر میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے بعد مولانا نے مؤطا امام مالک ہی کو باقاعدہ درس کے لیے منتخب کیا اور کئی سالوں سے یہ کتاب زیر درس ہے۔ تدبر میں اس درس کے بعض حصے شائع کرنے کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا ہے۔ اس کے باوجود انکارِ سنت اور انکارِ حدیث کا الزام دینے والے کو اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ محاسبۂ آخرت کے بارے میں کتنا جری ہے!

فلسفہ اور افکار کے در آنے کی وجہ سے اس وقت کی مسلم سوسائٹی میں پیدا ہوئے۔ معتزلہ نے فلسفہ یونان کو آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ عباسی دربار میں عیسائی علماء کے اعتراضات کے تابڑ توڑ جواب دیئے تھے۔ اس عہد کے سربر آوردہ لوگ اس بنا پر ان سے متاثر تھے۔ ہمارے دینی مدارس میں آج تک یونانی فلسفہ و منطق کے ذیل میں جو چیزیں پڑھائی جاتی ہیں ان کے تدارک میں منقولات کو چھوڑ کر جو عقلی دلائل دیئے جاتے ہیں وہ کم و بیش وہی ہوتے ہیں جو معتزلہ نے قائم کئے تھے اور جنہیں بعد میں امام ابوالحسن اشعری، امام فخر الدین رازی اور امام غزالی نے تھوڑے رد و بدل کے بعد اہل سنت کے عقائد کے ساتھ ہم آہنگ کر لیا تھا۔ یہ جو علامہ اقبالؒ نے سوز و سازِ رومی کے ساتھ پیچ و تابِ رازی میں زندگی کی راتیں گزاری ہیں۔ ان سے مراد وہی عقلی استدلال ہے جس کی خشتِ اوّل اسلامی تاریخ میں معتزلہ نے رکھی تھی۔ علامہ فراہی اور مولانا اصلاحی نے کسی بھی جگہ معتزلہ کے دلائل کو من و عن نہیں اپنایا ہے۔ اس لئے کہ معتزلہ کے طرز استدلال کی بنیاد فلسفۂ یونان کے عقلی مسلمات ہوا کرتے تھے جبکہ ہمارے ان دو بزرگوں نے ایک ایسے علم کلام کو فروغ دینے کی کوشش کی ہے جس کی اٹھان قرآن مجید میں دیئے گئے آفاق و انفس میں پائے جانے والے فطری دلائل سے اٹھائی گئی ہے۔ یہ دونوں حضرات معتزلہ کی دقیانوسی عقل پرستی کے کبھی قائل نہیں رہے۔ ان کے نزدیک قرآن مجید نے اس نظامِ کائنات کی تشکیل کے اندر اور انسان کی خلقت میں پائے جانے والے قدرت حق کے شواہد پر غور و فکر کی جو بار بار دعوت دی ہے۔ اسلامی فکر کے طلبہ کو اپنے استدلال کی بنیاد اسی پر رکھنی چاہیئے۔ ان کے نزدیک فلسفہ یونان نہیں فلسفہ جدید کی پھیلائی ہوئی گمراہیوں کے لیے بھی یہ قرآنی دلائل اور ان سے پھوٹنے والا اندازِ فکر ہی برہان قاطع کی حیثیت رکھتا ہے۔ علامہ حمید الدین فراہی نے قرآن مجید کی آخری سورتوں کی تفسیر میں بڑی ہنرمندی کے ساتھ اس طرز استدلال کی دیواریں چنی ہیں اور مولانا اصلاحی نے اس قدر خوبصورت زبان میں عربی سے اردو میں ان کا ترجمہ کیا ہے کہ مولانا مودودی جیسا صاحب طرز انشا پرداز داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ طالبان علوم قرآنی کو اس کتاب (مجموعہ تفاسیر فراہی) کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیئے۔

راقم السطور قرآنی علوم اور عربی زبان دونوں میں مبتدی کا درجہ بھی نہیں رکھتا اور اس کی حیثیت ایک طفل مکتب کی سی بھی نہیں ہے لیکن اس کا وجدان یہ ضرور کہتا ہے کہ خالصتاً قرآنی علم کلام کو فروغ دینے اور کلام خداوندی کی آیات میں باہمد گر ربط و نظم کی کڑیاں تلاش کرنے میں علامہ فراہی اور مولانا اصلاحی نے جو کام کیا ہے اس کی قدر یہ نہیں تو آنے والا زمانہ ضرور کرے گا۔ ہمارے یہاں جس طرح کلام غالب کو حیات غالب میں کوئی قدر شناس نہیں ملا تھا لیکن انیسویں اور بیسویں صدی کے سنگم پر غالب کے جادو نے سر چڑھ کر بولنا شروع کر دیا تھا اسی طرح کیا عجب کہ اکیسویں صدی علوم قرآنی میں فراہی کے طرزِ استدلال کی صدی بن جائے۔ علامہ فراہی ایک گوشہ نشین اپنے خیالات

میں مستغرق رہنے والے طالب قرآن تھے۔ ۱۹۳۰ء میں ان کا انتقال ہوا تو سید سلیمان ندوی مرحوم نے جنہیں علامہ اقبالؒ نے شبلی کے بعد اپنا مرجع قرار دیا تھا، جو تعزیتی مضمون لکھا اس سے یہ اقتباسات نقل کر کے اپنی گزارشات ختم کرتا ہوں[ا]

" الصلوٰۃ علی ترجمان القرآن (مفسر قرآن کی نماز جنازہ) وہ صدا ہے جو آج سے ساڑھے چھ سو برس پیشتر مصر و شام سے چین کی دیواروں تک ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی نماز جنازہ کے لیے بلند ہوئی تھی۔ حق ہے کہ یہ صدا آج پھر بلند ہو اور کم از کم ہندوستان سے مصر و شام تک پھیل جائے کہ اس عہد کا ابن تیمیہ ۱۱ نومبر ۱۹۳۰ء کو اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ وہ جس کے فضل و کمال کی مثال آئندہ بظاہر حال عالم اسلامی میں پیدا ہونے کی توقع نہیں، جس کی مشرقی و مغربی جامعیت عہد حاضر کا معجزہ تھی۔ عربی کا فاضل یگانہ اور انگریزی کا گریجوایٹ، زہد و ورع کی تصویر، فضل و کمال کا مجسمہ، فارسی کا بلبل شیراز، عربی کا سوق عکاظ، ایک شخصیت مفرد لیکن ایک جہان دانش، ایک دنیائے معرفت، ایک کائنات علم، ایک گوشہ نشین مجمع کمال، ایک بے نوا سلطان ہنر، علوم ادبیہ کا یگانہ، علوم عربیہ کا خزانہ، علوم عقلیہ کا ناقد، علوم دینیہ کا ماہر، علوم القرآن کا واقف اسرار، قرآن پاک کا دانائے رموز، دنیا کی دولت سے بے نیاز، اہل دنیا سے مستغنی، انسانوں کے رد و قبول اور عام کی داد و تحسین سے بے پرواہ، گوشۂ علم کا معتکف اور اپنی دنیا کا آپ بادشاہ۔ وہ ہستی جو تیس برس کامل قرآن پاک اور صرف قرآن پاک کے فہم و تدبر اور درس و تعلیم میں محو، ہر شے سے بیگانہ اور ہر شغل سے ناآشنا تھی۔ اس سے پہلے ہندوستان کے جن اکابر علماء کا ماتم کیا گیا ہے وہ کل وہ تھے جن کی ولادت اور نشو و نما انقلاب زمانہ سے پہلے ہوئی تھی۔ آج سب سے پہلی دفعہ ہم نئے عہد کے سب سے پہلے عالم کی وفات کے ماتم میں مصروف ہیں۔ جس سے پہلے ان تمام علماء نے جو نئے علم کلام کا اپنے کو بانی کہتے اور سمجھتے ہیں جو کچھ کہا اور لکھا وہ دوسروں کی سنی سنائی باتیں تھیں لیکن اس جماعت میں یہ پہلی ہستی تھی جس نے فلسفہ حال کے متعلق نفیاً و اثباتاً جو کچھ کہا وہ اپنی ذاتی تحقیق اور ذاتی علم و مطالعہ سے . . . (یادِ رفتگاں)

[ا] ڈاکٹر صاحب نے اپنے مضمون میں مولانا فراہی کا ذکر نہایت تحقیر کے ساتھ کیا ہے اور یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اگر وہ بھی کسی التفات کے قابل کوئی شخصیت ہوتے تو علامہ اقبالؒ جو سید سلیمان ندوی کو سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے، مولانا فراہی سے کیوں تغافل برتتے۔ سید صاحب کی تصنیف "یادِ رفتگاں" کے اس اقتباس کو اس پس منظر میں پڑھا جائے۔

بشکریہ روزنامہ نوائے وقت ۲۴، ۲۵ نومبر ۱۹۸۰ء

تالیفات امام حمیدالدین فراہیؒ

	روپے پیسے
۱۔ مجموعہ تفاسیر فراہی :	۶۰-۰۰
۲۔ اقسام القرآن :	۵-۰۰
۳۔ ذبیح کون ہے ؟	۵-۰۰

تالیفات مولانا امین احسن اصلاحی

۱۔ تدبر قرآن : (مکمل سیٹ : ۹ جلد) :	۸۱۰-۰۰
" : فی جلد :	۹۰-۰۰
۲۔ مبادیٔ تدبر قرآن :	۱۶-۰۰
۳۔ اسلامی قانون کی تدوین :	۱۲-۰۰
۴۔ اسلامی ریاست :	۳۰-۰۰
۵۔ اسلامی ریاست میں فقہی اختلافات کا حل :	۱۶-۰۰
۶۔ قرآن میں پردے کے احکام :	۳-۰۰
۷۔ تنقیدات :	۱۸-۰۰
۸۔ توضیحات :	۲۱-۰۰
۹۔ تزکیۂ نفس : جلد اوّل	۴۵-۰۰
: جلد دوم	(زیر طبع)
۱۰۔ اصول تدبر حدیث :	(")
۱۱۔ دعوت دین اور اس کا طریق کار :	(")
۱۲۔ اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام :	(")
۱۳۔ حقیقت شرک و توحید :	(")
۱۴۔ حقیقت نماز :	(")
۱۵۔ حقیقت تقویٰ :	(")

فاران فاؤنڈیشن

۱۲۲۔ فیروزپور روڈ، اچھرہ، لاہور۔۱۶ (پاکستان) فون : ۴۱۰۸۴۹